(ماخذ: بلوچستان میں اردو افسانے کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ = از مسز مبارکہ حمید
نوید پبلی کیشنز کوئٹہ 2001ء

حسن عسکری کے افسانوں میں مغربی افسانہ نگاروں کا اثر نظر آتا ہے خاص طور پر وہ چیخوف سے بہت متاثر ہے۔ وہ اپنے مجموعے جزیرے کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"(!) ایک چیز کے حسن کو میں نے واقعی اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کیا ہے اور اتنے شدید طور پر کہ اس احساس کی لرزش جب چاہوں اپنے اندر پا سکتا ہوں۔ اور وہ چیخوف کا افسانہ "سکول مسٹرس" ہے یہ خالص موسیقی ہے اور میں اس کوشش میں رہا ہوں کہ یہ ہی نغمگی اپنے افسانے میں پیدا کر سکوں میرا افسانہ "حرامجادی" چیخوف کے اسی افسانے سے متاثر ہے اس میں کچھ ہے تو اسے جمال مشین کا عکس ہی سمجھئے اور اسی طرح "چائے کی پیالی" کا خیال بھی مجھے چیخوف کے "اسٹیپ" سے پیدا ہوا تھا"۔

ہم نے چیخوف اور موپاساں دونوں کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا ہے تیکنیک کے لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے افسانوں میں پلاٹ کا ہونا اور نہ ہونا دونوں طریقوں پر عمل ہوا ہے۔ موپاساں کے یہاں پلاٹ اور فنی ترتیب کا ہونا ضروری ہے۔ چیخوف کے ہاں پلاٹ اور فنی ترتیب کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک فرق یہ ہے کہ موپاساں کے افسانے ختم ہونے کے بعد قاری کا ذہن مطمئن ہو جاتا ہے لیکن چیخوف کے افسانے کسی بات کو آخر تک نہیں پہنچاتے۔ آخر میں چیخوف کچھ کہتے کہتے رک جاتا ہے اور پڑھنے والا آگے سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمیں افسانے کے اندر کوئی معنی خیز اشارہ مل جاتا ہے۔ جو افسانے کو انجام تک پہنچانے میں ہماری مدد کرتا ہے۔

موپاساں اور چیخوف کے افسانوں سے ہمارے اردو افسانہ نگار منٹو، عصمت چغتائی، بیدی اور کرشن چندر بہت متاثر ہوئے ہیں ہم ان افسانہ نگاروں کا جائزہ لیتے ہیں۔

ہمارے اردو افسانہ نگاروں میں منٹو اور بیدی، کرشن چندر اور عصمت مغرب کے ان دو افسانہ نگاروں موپاساں اور چیخوف سے بطور خاص متاثر ہوئے ہیں۔ ان کے بعض افسانوں میں ان دونوں افسانہ نگاروں کے اثرات نظر آتے ہیں۔

اردو افسانہ نگاری کے آغاز سے لیکر 1947ء تک کے افسانوں کا مختصر جائزے کے بعد اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

اردو افسانہ نگاری کا مطالعہ اس کے رجحانات عہد بہ عہد کی تبدیلیوں کا جائزہ اور اس کی روشنی میں

مقالہ ہے۔ اب [illegible] مئی ۱۹۱۹ء

بلوچستان میں اردو افسانہ نگاری کے رجحانات کا جائزہ ہمارے مطالعہ کا اصل موضوع ہے۔

اس لحاظ سے ہم نے اس پس منظر کے ساتھ ساتھ جس نے داستان سے لے کر افسانے تک کا سفر طے کیا، ابتدائی افسانہ نگار پریم چند اور یلدرم کے افسانوں اور ان کے اندر موجود رجحان اور رویوں کی طرف بھی ہلکے ہلکے اشارے کئے ہیں تاکہ بلوچستان کی افسانہ نگاری کو اس کے پس منظر میں دیکھا جا سکے بلوچستان میں اردو افسانہ نگاری کا بیک گراؤنڈ زیادہ مضبوط نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجوہات میں سے ایک وجہ یہاں کے تہذیبی رویے اور بیک وقت مختلف زبانوں کا رائج ہونا ہے۔ یہاں بلوچی پشتو اور براہوی زبانوں کے علاوہ فارسی اور دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان بھی بولی جاتی ہے۔ اس لئے یہاں ابتداء میں صرف اردو میں افسانوں کی طرف اتنی زیادہ توجہ نہیں ملی اور اگر لکھے بھی گئے تو وہ فنی اور تیکنیکی لحاظ سے کمزور افسانے تھے لیکن بعد میں تہذیبی ترقی اور علمی و ادبی سرگرمیوں کے سبب اس فن کی طرف خصوصی توجہ ہوئی۔ اس میں سب سے پہلے جو نام اپنی طرف متوجہ کرتا ہے وہ یوسف عزیز مگسی کا ہے۔

بلوچستان میں اردو افسانہ نگاری کے ابتدائی نقوش

"بلوچستان میں اردو افسانے کا باقاعدہ آغاز کی تحقیق و جستجو میں جو نام ہمارے سامنے آیا ہے وہ یوسف عزیز مگسی کا افسانہ "تکمیل انسانیت" ہے"۔ یہ افسانہ چار قسطوں یکم مئی، ۸ مئی، ۱۵ مئی اور ۲۲ مئی ۱۹۳۴ء میں لکھا گیا اور "بلوچستان جدید کراچی" میں شائع ہوا۔(9)

"تکمیل انسانیت"۔ اس افسانے میں کہانی یوں ہے کہ عزیز احمد ایک نواب کے فرزند تھے وہ تین بھائی تھے۔ ان کے بڑے بھائی نے نواب صاحب کے انتقال کے بعد چھوٹے بھائیوں عزیز احمد اور رشید احمد دونوں پر ظلم و ستم ڈھائے اور جائیداد بھی غیر منصفانہ طریق سے تقسیم کی۔ یہ وہ دور ہے جب ملک میں تحریک آزادی کا زور تھا۔ عزیز احمد اس سے متاثر ہوئے اور انہوں نے اس سلسلے میں ایک مضمون بھی لکھا جس میں مسلمانوں کو غلامی کی زنجیروں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے میدان جہاد میں نکلنے کی ہدایت کی تھی۔ اس وجہ سے انہیں قید کر لیا گیا۔

انہوں نے قید میں بھی نامرتی سے تمام صعوبتیں برداشت کیں۔ لیکن ان کے عزائم میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ الغرض وہ قید میں بھی عبادت الٰہی میں مصروف رہے اور اپنے بھائیوں کو راہ راست پر لانے کی دعائیں کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی اسی خادمی اور جذبہ ایثار کی وجہ سے تکمیل انسانیت کا مقام پایا۔

عزیز کمسی کے اس افسانے میں عزیز احمد کا کردار بہت ہمدرد انسانی محبت و خلوص کے جذبے اور ایثار سے لبریز ہے۔ سیاسی اعتبار سے آزادی کی تمنا ہے۔ مذہبی رجحان اور حب الوطنی کے جذبات حاوی ہیں۔ کہانی میں تسلسل ہے جو قاری کے دل میں اچھا تاثر چھوڑتا ہے۔

اسی طرح بلوچستان میں ایک اور افسانہ "عروس عجم" کے نام سے علامہ ناصر بلوچستانی نے "الحنیف" جیکب آباد سالنامہ فروری ۱۹۳۷ء میں ص نمبر ۷۸۔۸۱ میں تحریر کیا ہے۔

اس میں کہانی اس طرح ہے کہ روس اور ایران کے تعلقات کشیدہ ہونے کی وجہ سے جب دونوں ملکوں کے درمیان اعلان جنگ کر دیا گیا تو دونوں کی فوجیں سرحد ایران پر جمع ہو گئیں۔ عین اسی دن یوسف نامی شخص کو ایرانی فوج کے ساتھ جانا پڑا۔ اتفاق سے اسی دن یوسف کا نکاح ہوا تھا۔ اس کی بیوی کنیز فاطمہ بہت رنجیدہ ہوئی اس سے یوسف کی تنہائی برداشت نہیں ہو سکی وہ مردانہ لباس پہن کر میدان جنگ میں جا کر ایرانی فوج میں شامل ہو گئی۔ اور دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئی ایران کو فتح نصیب ہوتی ہے۔ میدان جنگ میں یوسف کی نگاہ جب کنیز فاطمہ کی لاش پر پڑی تو وہ حیران و ششدر رہ گیا فوراً بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔ اور اس کی سانسیں رک گئیں۔

علامہ بلوچستانی کے اس افسانے میں بھی حب الوطنی کے جذبات حاوی ہیں رجحان کے اعتبار سے یہ رومانیت اور حقیقت پسندانہ میلان رکھتا ہے۔ اس افسانے میں ڈرامائی انداز ہے۔ اس میں معاشرتی سطح پر بلوچستان کی زندگی کا وہ رخ نمایاں ہے جس میں خواتین بھی مردوں کی طرح بہادر اور ہر قسم کے مصائب جھیلنے کی عادی ہوتی ہیں۔ وہ حوادث زمانہ کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ میدان جنگ میں مقابلہ کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو اس سے بھی دریغ نہیں کرتی ہیں۔

بلوچستان میں ہفت روزہ اخبار "پاسبان" جن کی اشاعت ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۱ء تک کے عرصہ میں ہوئی یہ بہت پرانا اخبار ہے اردو افسانہ نگاری کی تحقیق اور جستجو میں یہ اخبار بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں ۲۰۔۲۵ افسانے شامل ہیں۔ جن میں بیشتر افسانے ایسے ہیں جن پر مصنف کے نام تحریر نہیں ہیں لیکن بلوچستان میں اردو افسانہ نگاری کے ابتدائی نقوش ہفت روزہ "پاسبان" کے ذریعہ سے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اور انہیں افسانوں کے ذریعہ برصغیر کی تقسیم سے قبل بلوچستان میں لکھے جانے والے افسانوں کے رجحانات کا سراغ ملتا ہے۔ اس کا سب سے پہلا افسانہ انصاف ہے۔

"انصاف"۔ یہ افسانہ ہفتہ وار اخبار "پاسبان" کوئٹہ ۶ جولائی ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا ہے۔ اس افسانے میں سریش کی ماں بیمار ہوتی ہے اس لیے اسے بہت سے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے لیکن کہیں سے بھی اسے بیمار ماں کی دوائی کے لیے پیسے نہیں ملتے اس لیے مجبور ہو کر وہ چوری کرتا ہے جس کی وجہ سے اسے جیل جانا پڑتا ہے۔ سریش آزاد ہو کر جب جیل سے واپس آتا ہے تو اسی رات وہ ایک کوٹھی سے ایک لڑکی کی چیخ و پکار کی آواز سنتا ہے۔ کوٹھی میں داخل ہوتا ہے سیٹھ کانکا پرشاد کو ایک بے کس و غریب دوشیزہ کی عصمت فروشی کرتے دیکھ کر اسے غصہ آتا ہے۔ وہ سیٹھ کانکا پرشاد کو قتل کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ قتل کے جرم میں دوبارہ جیل چلا جاتا ہے۔ یہاں ہمدردی اور نیکی کا جذبہ اسے گناہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

اس افسانے میں معاشی مجبوریوں اور جنسی بے راہ روی کے حوالے سے فرائڈ اور مارکس کے نظریات کا عکس جھلکتا ہے۔ اس افسانے میں معاشرتی سطح پر ان خامیوں کی طرف نشاندہی کی گئی ہے جو مفلسی و ناداری سے جنم لیتی ہے۔ اور طبقاتی اونچ نیچ کے سبب پیدا ہونے والے دباؤ سے بعض اوقات جس قسم کے جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ بلوچستانی ادب خصوصاً افسانہ بھی قومی سطح کے سماجی، معاشرتی، جغرافیائی اور سیاسی حالات سے متاثر ہوا۔

"دیوتا" یہ افسانہ ہفتہ وار اخبار "پاسبان" میں ۱۲ اگست ۱۹۳۹ء میں چھپا ہے۔

اس افسانے میں صرف تین کردار ہیں۔ دیریش، اس کی بیوی پربھا اور بیوی کا کلاس فیلو رمیش، اس افسانے میں دیریش اور اس کی بیوی میں ذہنی فاصلوں کو دکھایا گیا ہے۔ یہ فاصلہ دیریش کی خاموشی پیدا کرتی ہے دیریش گھر سے چلا جاتا ہے۔ اور کئی سال بعد لوٹتا ہے تو خاموش رہنے لگتا ہے۔ یہ بات اس کی بیوی پربھا کو بری معلوم ہوتی ہے وہ اس کی خاموشی کی وجہ دریافت کرتی ہے لیکن وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ اس بات سے تنگ آ کر وہ اپنے پرانے کلاس فیلو رمیش کے پاس چلی جاتی ہے ایک طویل عرصہ گزر جاتا ہے اس دوران پربھا کے کئی بچے ہو جاتے ہیں۔ رمیش ترقی کر کے جیل کا سپرنٹنڈنٹ بن جاتا ہے اور وہاں ایک روز دیریش قیدی کے روپ میں نظر آتا ہے جو عدم تشدد تحریک کا سیاسی قیدی تھا۔ جسے دیکھ کر پربھا کے آنسو نکل آتے ہیں اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلتا ہے۔ "دیوتا" یہیں افسانہ ختم ہو جاتا ہے۔

اس افسانے میں رومانیت اور سیاست کا ملا جلا رویہ ہے۔ جس میں سیاسی نصب العین حب الوطنی کے باوصف جذباتی اور رومانی انداز غالب ہے۔ فنی اعتبار سے اس افسانے میں خامیاں ہیں۔ کہانی میں کوئی تسلسل

نہیں ہے۔ یہ دیریش اور اس کی بیوی پربھا کی کہانی ہے۔ لیکن اس افسانے میں بعض ٹیکنیکل خامیاں ہیں جیسے دیریش کی بیوی دیریش کی خاموشی سے تنگ آکر اچانک اپنے کلاس فیلو ریشی کے پاس چلی جاتی ہے۔ وہاں اس کے پاس جاکر بیوی کی حیثیت سے رہنے کا کوئی منطقی جواز نظر نہیں آتا۔ پھر ریشی کے عدم تشدد تحریک میں شامل ہونے یا اس کی حب الوطنی کے نقطۂ نظر سے بھی کوئی دلیل ایسی نظر نہیں آتی۔ جس کے سبب اسے دیوتا کا خطاب دیا جاسکتا۔

"گوشت کا ٹکڑا" ۔ یہ افسانہ ہفت روزہ پاسبان میں ۲۸ اگست ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا ہے۔ لیکن اس کے مصنف کا نام اس پر درج نہیں ہے۔ اس افسانے میں عربوں کی روایتی مہمان نوازی کے انداز کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ عرب کے ایک بوڑھے کی کہانی ہے۔ جس کے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہوتا اور ایک مہمان آجاتا ہے تو بوڑھا گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہ ہونے کے سبب اپنی ران سے گوشت کاٹ کر اس نوجوان مہمان کو پکاکر کھلاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے یہ افسانہ عرب کی لوک کہانی سے ماخوذ ہے جہاں مہمان نوازی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ورنہ بوڑھے کا اپنی ران کا گوشت کاٹ کر مہمان کی خاطر کرنے میں کوئی منطقی جواز نظر نہیں آتا۔

"بھکارن" ۔ یہ افسانہ ہفت روزہ پاسبان میں ۱۲ ستمبر ۱۹۳۹ء میں چھپا ہے اس کے مصنف کا نام بھی درج نہیں ہے اس افسانے میں ایک بھوکی غریب و نادار بھکارن کی کہانی ہے۔ وہ بھیک مانگتی ہے ہوٹل میں دکانوں میں ریلوے اسٹیشن پر سودا بیچنے والے' خوانچے والے سب جگہوں میں بھیک مانگنے کی غرض سے جاتی ہے۔ لیکن کوئی بھی اسے بھیک نہیں دیتا۔ اور جب وہ بھوک سے تنگ آکر بے شرمی پر اتر آتی ہے سب کے ساتھ بے شرمی و بے حیائی سے باتیں کرتی ہے تو سب لوگ اس کی طرف توجہ دیتے ہیں اور اسے پیسے بھی دیتے ہیں۔

اس افسانے میں معاشی مجبوریوں اور افلاس کے تحت پیدا ہونے والی ان معاشرتی خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو جنسی کجروی کو جنم دیتا ہے۔ مفلسی کیسے کیسے کرداروں کو جنم دیتی ہے۔ طبقاتی اونچ نیچ کے ذریعہ تشکیل شدہ معاشرہ کس طرح عورت کو اور اس کی غیرت کو فروخت کرتا ہے اور اس قسم کے معاشرے میں مرد کس طرح عورت کی مجبوری کو کیش کرتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال پاسبان میں چھپنے والا افسانہ "بھکارن" ہے۔ بیسوی صدی کے ابتداء میں دو مفکرین فرائڈ اور مارکس کے نظریات اردو ادب کی ہر صنف پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ افسانہ "بھکارن" میں بھی انہیں دونوں کے نظریات کا عکس گہرا ہے۔ معاشی اور جنسی حوالے سے

اس افسانے میں بھکارن کی بھوک اور اس کا افلاس اس بھکارن کو تلخ حقائق کی اس منزل پر لے جاتا ہے۔ جہاں بھوک سے تنگ آکر وہ معاشرتی قوانین کی دھجیاں بکھیر دیتی ہے۔ معاشرے کے بنائے ہوئے قانون جہاں عورت کو عزت و ناموس کی علامت قرار دی گئی ہے۔ وہاں وہ اسی عزت و ناموس کے ہاتھوں بھوک اور افلاس سے دوچار ہے۔ اور جب وہ اس منافق معاشرے کے بنائے ہوئے جھوٹے قوانین سے خود کو آزاد کرلیتی ہے تو عزت و ناموس کے علمبردار مرد ہی سب سے پہلے آگے آکر اس کی عزت و ناموس سے کھیلتے ہیں۔ جس کے عوض اس کو پیٹ بھر کے روٹی نصیب ہوتی ہے۔ قول و فعل کے تضاد سے قائم ہمارے معاشرے کی بہترین عکاسی اس افسانے کے ذریعہ کی گئی ہے۔

افسانہ بھکارن میں معاشرے میں ہونے والی طبقاتی اونچ نیچ جھوٹ اور منافقت کی بنیادوں پر قائم معاشرتی قوانین' مذہبی اصول اور قوانین جو مردوں اور عورتوں کے لیے مختلف ہیں ان پر گہرا طنز اور موثر تصویر پیش کی گئی ہے۔

"بڈھا قلی" ۔ یہ افسانہ ہفت روزہ پاسبان میں ۲۸ ستمبر ۱۹۳۹ء میں چھپا ہے اس افسانے میں اس کے مصنف کا نام موجود نہیں ہے۔ اس میں سکندر بخت قلی کی دکھ بھری کہانی پیش کی گئی ہے۔ اس کی منگنی اس کے چچا کی بیٹی زبیدہ کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ لیکن اسے روزگار نہ ملنے کی وجہ سے چچا زبیدہ کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ سکندر بخت چچا کا گھر چھوڑ کر مختلف شہروں میں مارا مارا پھرتا ہے۔ آخر میں شملہ ریلوے پلیٹ فارم میں قلی گیری کا کام شروع کر دیتا ہے۔ بوڑھا ہو جانے کی وجہ سے سواری کم ملتی ہے۔ جس کی وجہ سے نوبت فاقوں تک پہنچ جاتی ہے۔ زبیدہ اسے اس دوران جگہ جگہ ڈھونڈتی ہے آخر شملہ پلیٹ فارم سے ڈھونڈ نکالتی ہے۔ سکندر بخت بھی اسے پہچان لیتا ہے۔ لیکن ماضی کی تلخیوں نے اس کا ذہن خراب کر دیا تھا۔ اس لیے سکندر بخت اسے دیکھ کر بھاگتے ہوئے ایک برساتی نالے میں گر جاتا ہے زبیدہ اس کا تعاقب کرتی ہوئی خود بھی اسی نالے میں گر جاتی ہے۔

اس افسانے میں سکندر بخت کا کردار محنتی جفاکش خوددار اور حساس ہے۔ اس میں معاشرتی زندگی اور اس کی کمزوریوں کی نشاندہی ملتی ہے رجحان کے اعتبار سے اس میں جذباتی اور رومانی انداز غالب ہے۔ اس دور کے افسانوں میں اصلاحی مقصد حاوی ہے۔ لیکن فنی لوازم اس مقصد کے باوجود کہانی کو غیر دلچسپ نہیں ہونے دیتا۔

"قاتلہ" ۔ یہ افسانہ بھی ہفت روزہ "پاسبان" میں ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں چھپا ہے اس کے مصنف کا نام بھی موجود نہیں ہے۔

اس میں ایک بہت مفلس اور بے کس عورت کی کہانی ہے اس کا ایک چھوٹا بچہ ہے خاوند مرچکا ہے مفلسی کی یہ حالت ہے کہ بھیک بھی مانگنے سے نہیں ملتی ہے۔ نوکری کرنا چاہتی ہے لیکن بچے کی وجہ سے نوکری نہیں ملتی ہے بلکہ بچے کی وجہ سے اس پر الزام تراشی کی جاتی ہے۔ لوگوں کی حقارت آمیز نظر اور مفلسی سے تنگ آکر وہ دریائے جمنا میں کود جاتی ہے۔ وہ تو بچ جاتی ہے لیکن اس کا بچہ مرجاتا ہے۔ لوگوں کی نظروں میں وہ بچے کی قاتل بن جاتی ہے حتیٰ کہ عدالت بھی اسے یہی فیصلہ سناتی ہے۔ اور وہ قانون کی نظر میں بھی بچی کی قاتل ہوتی ہے۔

یہ ایک دردناک کہانی ہے ایک ماں بچے کی قاتل کیسے ہوسکتی ہے یہ زندگی کے گہرے دکھ سے جنم لینے والی ایک ایسی کہانی ہے جو زندگی سے فرار کے بھیانک انجام پر منتج ہوتی ہے۔ دراصل یہ ہمارے بگڑے ہوئے معاشرتی نظام کی نشاندہی کرتی ہے۔ اور یہ ہمارے اس قانون کی نشاندہی کرتی ہے جو انصاف سے عاری ہے۔ انصاف اور قانونی سسٹم کی اس خامی کو افسانہ نگار نے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

"اختتام سفر" ۔ یہ افسانہ ہفت روزہ پاسبان میں ۲ نومبر ۱۹۳۹ء میں چھپا ہے اس سے پہلے افسانوں کی طرح اس افسانے میں بھی مصنف کا نام درج نہیں ہے۔

اس افسانے میں ایک سولہ سالہ لڑکی مالتی کی کہانی ہے۔ جو سوتیلی ماں کے ظلم وستم سے تنگ آکر اور ایک ستر سالہ بوڑھے موہن سے اپنی شادی کا بندوبست دیکھ کر خوفزدہ ہوکر گھر سے بھاگ جاتی ہے اور ایک ٹرین میں بیٹھ جاتی ہے۔ اتفاق سے موہن جس سے شادی طے ہوتی ہے وہ بھی اسی ٹرین میں سفر کرتا ہے۔ دونوں کی باہم گفتگو سے ان کی راہیں الگ ہوجاتی ہیں۔

اس افسانے میں لڑکیوں پر ہونے والے اس ظلم کی کہانی پیش کی گئی ہے جہاں اسے انسان نہیں سمجھا جاتا۔ اور اس کے جذبات اور احساسات کا احترام نہیں ہوتا۔ والدین روپوں کے لالچ میں کمسن لڑکیوں کی شادی عمر رسیدہ مردوں کے ساتھ طے کرکے ان کی زندگی تلخ کردیتے ہیں۔ اس افسانے میں ہمارے سماج کی کھوکھلی بنیادوں پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔ یہ افسانہ ہمارے معاشرتی نظام کی کمزوریوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ رجحان کے اعتبار سے اس میں اصلاحی اور نفسیاتی رجحان غالب ہے۔

"بھونچال" ۔ یہ افسانہ ہفت روزہ "پاسبان" میں ۱۲ دسمبر ۱۹۳۹ء میں چھپا ہے۔ اس افسانے میں بھی

مصنف کا نام درج نہیں ہے۔

یہ افسانہ بے سہارا غریب سکینہ اور اس کے دو معصوم بچوں پر مشتمل ہے۔ اس کا خاوند فوت ہوجاتا ہے۔ وہ کرایے کے مکان میں رہتی ہے مکان کا کرایہ نہ دینے کی وجہ سے سیٹھ اور منشی سکینہ کو زبردستی گھر سے نکالنا چاہتے ہیں لیکن یکایک اولے پڑنے شروع ہوجاتے ہیں۔ بجلی چمکتی ہے اور دھواں دھار بارش شروع ہوجاتی ہے۔ پھر بجلی سیٹھ اور اس کے منشی پر گرتی ہے۔ اور دونوں موت کی نیند سوجاتے ہیں سکینہ اسی گھر میں رہتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد سکینہ کے دونوں بچے بڑے ہوجاتے ہیں اور اس کے دن پھر جاتے ہیں۔

یہ افسانہ معاشی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اور اس میں اس عہد کے ہندوستان کی مخصوص زندگی کی جھلک موجود ہے ان کی مجبوریاں اور بے بسی حقیقت پسندی کے رجحان سے روشناس کراتی ہے۔

"مہاجن" ۔ یہ افسانہ ہفت روزہ "پاسبان" میں ۱۲ فروری ۱۹۴۰ء میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں بھی مصنف کا نام درج نہیں ہے۔

اس افسانے میں بھی اصلاحی اور معاشی رجحان غالب ہے۔ یہ مہاجن اور اس کے محسن کے بیٹے کی کہانی ہے محسن کے بیٹے کو پانچ سو روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو وہ مہاجن کے پاس لینے جاتا ہے۔ لیکن وہ عذر پیش کرتا ہے کہ اس کے پاس نہیں ہیں۔ آخرکار محسن کے بیٹے کو اپنا مکان گروی رکھنا پڑتا ہے۔ مہاجن مکان کے تمام کاغذات عیاری سے اپنے نام لکھوا لیتا ہے اور آخر میں نیلام کروا دیتا ہے۔

یہ افسانہ بھی پہلے افسانوں کی طرح سماجی مسائل کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس دور کے افسانوں میں اصلاحی رجحان پایا جاتا ہے۔ لیکن فنی اعتبار سے اس میں پختگی نہیں ہے بس ایک کہانی پیش کی گئی ہے۔

"بھوکی" ۔ یہ افسانہ "پاسبان" میں ۲۸ فروری ۱۹۴۰ء میں چھپا ہے۔ لیکن اس کے مصنف کا نام درج نہیں ہے۔

اس افسانے میں ایک ایسی عورت کی کہانی ہے۔ جو بھوکی تھی۔ مفلس تھی اس نے لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ لوگوں نے بھیک دینے کے بجائے بے غیرت کہا۔ کوئی ایک آدھ بھولا بھٹکا اس کی ہتھیلی پر ایک آدھ پیسہ رکھ دیتا تھا۔ سارے دن میں چند پیسوں کے سوا کچھ نہ ملتا۔ تو اس نے مانگنے کے بجائے گناہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک سال بعد وہ ایک بچی کی ماں بن گئی۔ بھوک کے علاوہ وہ بیمار بھی رہتی ہے لیکن کسی نے اس کی مدد نہیں کی۔

اس افسانے میں معاشی مسائل اور جنسی رجحان حاوی ہے یہ افسانہ اس دور میں لکھا گیا ہے جب برصغیر میں انگریزوں کا تسلط تھا۔ اس عہد میں برصغیر میں پھیلی ہوئی غربت، افلاس اور جہالت کے سبب پیدا ہونے والے معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔

"کھوٹا روپیہ" ۔ یہ افسانہ ہفت روزہ اخبار "پاسبان" میں ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء میں لکھا گیا ہے۔ اس میں مصنف کا نام درج نہیں ہے۔

اس میں ایک غریب موچی کی کہانی ہے۔ وہ سارا دن محنت کر کے جوتے کا جوڑا بنا کر سیٹھ کے پاس لے جاتا ہے۔ وہ اس کو کھوٹا سکہ دیتا ہے کھوٹے سکے کی وجہ سے دوکاندار کھانے پینے کی اشیاء دینے سے انکار کر دیتا ہے وہ گھر خالی ہاتھ لوٹتا ہے۔ بچے بھوکے سو جاتے ہیں۔ چراغ میں تیل نہ ہونے کی وجہ سے گھر میں اندھیرا رہتا ہے۔

یہ افسانہ بھی معاشی بدحالی کی داستان ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا ہے کہ ہندوستانی اس وقت اسی قسم کے حالات سے دوچار تھا۔ یہ افسانہ کم اور کہانی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ فنی اعتبار سے بھی پختگی نہیں ہے۔

"مصیبت زدہ" ۔ یہ افسانہ ہفت روزہ "پاسبان" میں ۲۸ مارچ ۱۹۴۰ء میں لکھا گیا ہے۔ اس میں بھی مصنف کا نام درج نہیں ہے۔

اس میں جنیت اور اس کی بیوی برملا کی کہانی ہے۔ جنیت کو سیٹھ کے پاس ۲۵ روپے ماہوار پر نوکری مل جاتی ہے۔ چھ ماہ بعد وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ تو سیٹھ اس کی مزاج پرسی کے لیے اس کے گھر آتا ہے۔ اور اس کی بیوی برملا پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ برملا کو یہ برا لگا وہ سیٹھ کو برا بھلا کہتی ہے سیٹھ ناراض ہو جاتا ہے جنیت کی نوکری ختم ہو جاتی ہے پھر تلاش کے بعد بھی اسے کوئی نوکری نہیں ملتی فاقوں سے نڈھال ہو کر دونوں میاں بیوی حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے دنیا سے چل بسے۔

یہ افسانہ بھی معاشی بدحالی کی عکاسی کرتا ہے رجحان کے اعتبار سے اس افسانے میں معاشی اور جنسی حوالے سے مارکس اور فرائیڈ کے اثرات حاوی نظر آتے ہیں۔

"دکھی جوانیاں" ۔ یہ افسانہ ہفت روزہ اخبار "پاسبان" میں ۲۰ مئی ۱۹۴۰ء میں چھپا ہے۔ اس میں مصنف کا نام درج نہیں ہے۔

یہ افسانہ نوجوان نریندر اس کی بیوی کانتا اور چار معصوم بچوں کی کہانی ہے۔ جو معاشی تنگدستی کی

سے پریشان تھے نریندر کو کوشش کے باوجود کہیں نوکری نہیں ملتی۔ کوئی شخص ان کی مدد نہیں کرتا۔ بھوک سے نڈھال ہو کر دونوں میاں بیوی چار معصوم بچوں کو اکیلا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

اس افسانے میں انتہائی دردناک کہانی پیش کی گئی ہے یہ افسانہ بھی اپنے عہد کی معاشی بدحالی کا ترجمان ہے ان افسانوں میں بلوچستان کے ابتدائی افسانے ہونے کی وجہ سے فنی لوازم کم ہیں اس لیے اس افسانے میں افسانے سے زیادہ کہانی کا رنگ غالب ہے۔

"خدا کی دین" ۔ یہ افسانہ ہفت روزہ اخبار "پاسبان" میں ۱۲ اگست ۱۹۴۰ء میں چھپا ہے۔ اس میں بھی مصنف کا نام درج نہیں ہے۔

اس میں ایک شخص جمن چوری کی غرض سے آدھی رات کو ایک عالیشان محل میں جاتا ہے۔ وہاں رقص و سرور کی محفل جمی ہوئی دیکھتا ہے۔ ایک رقاصہ کا رقص دیکھ کر چوری کرنا بھول جاتا ہے۔ اچانک زلزلہ آجاتا ہے۔ اور وہ گر کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد دو قدم چلتا ہے تو اسے رات والی رقاصہ بے ہوش ملتی ہے وہ اس کی جان بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور کامیاب ہو جاتا ہے۔

اس افسانے میں بھی معاشی اور جنسی حوالے سے مارکس اور فرائیڈ کے اثرات نظر آتے ہیں ان کے علاوہ اس میں انسانی ہمدردی نیکی اور ایثار کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اصلاحی رنگ بھی غالب ہے۔

"تابوت" ۔ یہ افسانہ ہفت روزہ اخبار "پاسبان" میں ۲۰ اگست ۱۹۴۰ء میں لکھا گیا۔ اس میں بھی مصنف کا نام درج نہیں ہے۔ اس میں ایک بڑھیا فرسودہ لکڑی کی گاڑی پر صندوق نما تابوت میں اپنی جوان بیٹی کو دشمن کی سپاہ سے بچانے کی غرض سے بند کر کے خانقاہ کی طرف لے جا رہی تھی اور وہ خوش تھی کہ اپنی لڑکی کو سپاہیوں کی حریصانہ نظروں سے چھپا کر لے آئی ہے۔ شام ہونے سے کچھ دیر پہلے جب وہ ایک پہاڑی کے قریب پہنچتی ہے تو بڑھیا صندوق کا ڈھکن اٹھا کر اپنی بچی الزبتھ کو آواز دیتی ہے اور اٹھنے کو کہتی ہے۔ لیکن لڑکی مر چکی تھی بوڑھی عورت پر ایک وحشت طاری ہو گئی وہ غمگین و اداس ہو کر گاڑی کو واپس گاؤں کی طرف لے جاتی ہے۔

اس افسانے میں نہایت ہی عبرتناک اور دردناک کہانی پیش کی گئی ہے یہ افسانہ بھی اس عہد کی ترجمانی کرتا ہے جب ہندوستان معاشی بدحالی سیاسی کشمکش اور افراتفری سے دوچار تھا اس وقت عورتوں اور لڑکیوں کی عزتیں بھی غیر محفوظ تھیں۔ اس کے اثرات نے اردو ادب کی مختلف اصناف کو متاثر کیا ہے اردو افسانے

میں بھی اس کے اثرات زیادہ موثر انداز میں دکھائی دیتے ہیں۔

"رادھیکا" ۔ یہ افسانہ ہفت روزہ اخبار "پاسبان" میں ۱۲ ستمبر ۱۹۴۰ء میں چھپا ہے اس میں مصنف کا نام درج نہیں ہے۔

اس افسانے میں رادھیکا ایک ہندو لڑکی ہے دس سال کی عمر میں اس کے والد فوت ہو گئے۔ رادھیکا کی بیوہ ماں محنت مزدوری کر کے تعلیم دلواتی ہے اس گلی میں خان صاحب بھی رہتے ہیں۔ جو مسلمان تھے۔ رادھیکا کے والد کے ساتھ ان کے اچھے تعلقات تھے۔ کچھ عرصہ بعد اس کی والدہ بھی فوت ہو جاتی ہیں۔ اور وہ تنہا رہ جاتی ہے۔ ہندوستان میں سیاسی کشمکش اور افراتفری کے اس دور میں خان صاحب اس کی مدد کرتے ہیں۔ رادھیکا خان صاحب کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر ایک مسلمان فروز خان سے شادی کرتی ہے۔ فروز خان انسانیت کے اس زبردست سلوک و رویے سے بہت حیران ہوتے ہیں۔ ان کا دل خان صاحب کی عزت کے لیے جھک جاتا ہے۔

اس افسانے میں انسانیت کے ناطے ہندو اور مسلمان دو قوموں کی باہمی ہمدردی اور تعاون کو علامتی انداز میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو متحدہ ہندوستان کے سیاسی حالات کے تحت دونوں قوموں کے درمیان محبت اور اخوت کے جذبات ابھارنے کی کوشش ہے۔

"نیک دل مطرب" ۔ یہ افسانہ ہفت روزہ اخبار "پاسبان" میں ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۰ء میں چھپا ہے اس میں مصنف کا نام درج نہیں ہے۔

کہانی یوں ہے کہ ایک موسیقار اپنی بیٹی مریا اور بیٹا ولف گنگ کے ساتھ اپنی غربت دور کرنے اور کچھ پیسے جمع کرنے کی غرض سے اپنے وطن مالوف سیلز برگ سے وائنا کی طرف بحری سفر کرتا ہے۔ ولف گنگ وائنا میں اپنے کمالات دکھا کر بہت سی پونجی جمع کر لیتا ہے۔ اور وہ بہت لوگوں میں مشہور و معروف ہو جاتا ہے۔ بلکہ شاہی خاندان کے افراد بھی اس کو بہت پسند کرتے ہیں۔

اس افسانے میں معاشی رجحان کے تحت مارکسی نظریات پیش کیے گئے ہیں مجموعی طور پر ان افسانوں کا مرکزی موضوع غربت و افلاس سے پیدا ہونے والے مسائل ہیں۔

"دیوالی" ۔ یہ افسانہ ہفت روزہ اخبار "پاسبان" میں ۱۲ نومبر ۱۹۴۰ء میں لکھا گیا ہے اس میں بھی مصنف کا نام درج نہیں ہے۔

اس افسانے میں گورا اور اس کے بھائی رمیش کی کہانی ہے غربت و افلاس کی ماری گورا کا بھائی رمیش نوکری کی تلاش میں گھر سے باہر جاتا ہے۔ اس کے گھر میں دیوالی کے دن بھی اندھیرا ہے اسے نوکری مل جاتی ہے لیکن اس سے سیٹھ کا گملہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے پیسے نہیں ملتے۔ بلکہ اسے نوکری سے بھی نکال دیا جاتا ہے۔ دیوالی کی رات وہ خالی ہاتھ گھر واپس آتا ہے گورا اس کا انتظار کر کے بھوکی سو جاتی ہے۔

یہ افسانہ بھی اپنے عہد کے ان حالات کی عکاسی کرتا ہے جس سے ہندوستان دوچار تھا۔ اس افسانے کا موضوع بھی غربت اور افلاس سے پیدا ہونے والے مسائل ہیں۔

"افلاس" ۔ یہ افسانہ ہفت روزہ اخبار "پاسبان" میں ۴ فروری ۱۹۴۱ء میں چھپا ہے۔ یہ روسی ادیب میکسم گورکی کے ایک افسانے کا ترجمہ ہے۔ اس افسانے میں ایک اپاہج اور مفلس و نادار راگھو کی کہانی ہے۔ جس کی سات سال کی عمر میں چیچک سے آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں۔ ماں باپ مر جاتے ہیں بیوی اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ کھیت اور بیل وغیرہ دادا کا قرضہ اتارنے میں ختم ہو جاتے ہیں۔ سڑک پر تانگہ سے ٹکر ہو جانے کی وجہ سے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے۔ ایک جھونپڑی میں لاچار لوگوں کے رحم و کرم پر زندگی گزارتا ہے۔

اس افسانے میں بھی غربت و افلاس کی کہانی پیش کی گئی ہے دراصل ابتدائی دور کے افسانوں میں کہانی کا انداز زیادہ غالب ہے۔ ان افسانوں میں فنی شعور بالکل نہیں ہے۔

ہندوستان بیسویں صدی کے آغاز میں سیاسی، معاشی اور تعلیمی اعتبار سے شدید بحران سے دوچار تھا۔ اور انگریز دشمنی کے باعث مسلمانوں کی حالت دگرگوں تھی۔ اس دور میں شعراء اور ادباء نے اپنی تحریروں کے ذریعے برصغیر کی رہنمائی کا بیڑا اٹھایا۔ اس وقت ناول ہو یا افسانہ نظم ہو یا نثر جو کچھ بھی لکھا جا رہا تھا اس کا مقصد فرسودہ روایات اور پسماندگی کی دلدل سے برصغیر کو نکالنا تھا۔ کیونکہ بلوچستان کے ادیب بھی اسی ماحول کے پروردہ تھے اس لیے ان کے افسانوں میں بھی اسی رجحانات کی عکاسی ملتی ہے۔

ہم نے پاسبان کے افسانے "انصاف" "دیوتا" "بڑھا قلی" "بھکارن" "قاتلہ" "تابوت" "دیوالی" "سوکی" اور "افلاس" وغیرہ کا جائزہ لیا ہے۔ ان افسانوں میں مخصوص رجحانات کا عکس ہے۔ جو اس عہد کے بلوچستان کے معاشی اور سیاسی رویے سے تشکیل پاتے ہیں۔

پاسبان میں چھپنے والے یہ افسانے جن پر بیشتر افسانہ نگاروں کے نام درج نہیں ہیں۔ غالباً مشہور کہانیوں سے ماخوذ افسانے ہیں اس خیال کو تقویت اس بات سے بھی ملتی ہے۔ ۴ فروری ۱۹۴۱ء کو چھپنے والا افسانہ

"اقلاس" میکسم گورکی کے ایک افسانے کا ترجمہ ہے غرض یہ افسانے یا تو مشہور کہاوتوں کہانیوں یا بڑے ادیبوں کی کہانیوں سے ماخوذ ہیں۔ یا تراجم ہیں یا پھر پاسبان کے ایڈیٹر محمد عبداللہ کی تخلیقات۔ اس بات کا صحیح اندازہ اس لیے نہیں ہوتا کہ ان افسانوں میں لکھنے والے کا نام درج نہیں ہے۔ لیکن رجحان کے اعتبار سے یہ تمام افسانے معاشی تنگدستی سے پیدا ہونے والے مسائل کو پیش کرتے ہیں۔

اس عہد میں بلوچستان میں چھپنے والے بیشتر افسانے خواہ معاشی رجحان کے حامل ہوں۔ ان میں سیاسی رجحان ہو یا رومانیت کی رو ہو افسانہ نگاری کے فنی لوازم پورے نہیں کرتے۔ افسانہ نگاری میں لکھا ہوا پلاٹ ہو کردار ہوں آغاز ارتقاء اور اختتام ہو۔ یا بغیر پلاٹ کے جیسے چیخوف کے افسانوں میں اس قسم کی کوئی منطقی ترتیب نہ ہونے کے باوجود ایک اندرونی تنظیم افسانہ نگاری کے فنی تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ تاہم افسانہ دلچسپ ہونا چاہئے اور زندگی کے کسی بھی پہلو کو بھرپور تاثر کے ساتھ قاری تک پہنچانے پر قادر ہو تو افسانہ افسانہ نگاری کے فنی تقاضوں پر پورا اترتا ہے۔ "بلوچستان میں چھپنے والے یہ افسانے جو "پاسبان" کے ذریعے ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں بیشتر افسانے کہانی کے اعتبار سے بے ربطی کا شکار ہیں۔ بعض اوقات کچھ ایسے واقعات اچانک شامل ہو جاتے ہیں۔ جنہیں عقل تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔ [44]

تاہم عہد کو دیکھتے ہوئے اس قسم کی فنی کمزوریوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ ابتدائی مرحلے میں اس قسم کی کمزوریاں ادب کی ہر صنف میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ رجحان کے اعتبار ان تمام افسانوں میں معاشی اور جنسی حوالوں سے مارکس اور فرائیڈ کے اثرات حاوی ہیں۔

۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کے نتیجہ میں وہ لوگ جنہیں صدیوں کی جمی جمائی تہذیب، روایات اور آباؤ اجداد کی زمین کو خیرباد کہنا پڑا۔ نئی تہذیب اور نئے ماحول کے ساتھ خود کو اس ماحول میں فوری طور جذب نہیں کر سکے تہذیب کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا کرب ان کی تحریروں میں ابھر کر سامنے آیا۔ ۱۹۴۷ء کے لکھے جانے والے افسانے انسان کے ظلم اور بربریت کے خونریز واقعات سے بھرپور ہیں۔ جب انسان انسان سے باہر نکل کر زبان مذہب اور قوموں کی تفریق کے سبب ایک دوسرے کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ انسان برصغیر کی تقسیم سے قبل زندگی کے خواب اور اس کی تعبیر لے کر چل رہا تھا جو زندگی کو اس کے معاشی، معا اور جنسی حوالوں سے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جس میں زندگی کا حسن، انسانیت، محبت اور رفاقت کی خوشبو بسی تھی۔ وہ برصغیر کی تقسیم اور خونین فسادات کی لپیٹ میں آگیا۔ اس عہد میں لکھے جانے والے چند افسانے

چھوڑ کر بیشتر افسانے انسان کے منفی رویوں کی کہانیاں پیش کرتے ہیں۔ برصغیر کی تقسیم کے اثرات نے اردو افسانہ نگاری کو منفی انداز میں متاثر کیا معاشرتی اور تہذیبی انقلاب جو برصغیر کی تقسیم کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے عوام کی زندگی میں آیا۔ صدیوں کی جمی جمائی تہذیب سے کٹ جانے کا دکھ اور ہجرت کے مسائل نے ل کر ان کی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں کو بری طرح متاثر کیا۔

اردو افسانہ نگاری جو مخصوص اور معینہ خطوط پر ارتقاء کی منزل طے کر چکی تھی جس میں مغرب کے زیر اثر فرائڈ اور مارکس کے نظریات کے حوالے سے نئے زاویے اور زندگی کے نئے رخ سامنے آئے تھے۔ جس میں آزادی کی تمنا تھی۔ کچھ سہانے خواب تھے۔ زندگی کو معاشی اور جنسی حوالوں سے دیکھنے کی کوشش تھی۔ رومان تھا۔ حسن تھا رفاقت تھی ان تمام خوابوں کو فسادات میں ہونے والی درندگی اور جنسی شقاوت کے کھیل نے چکنا چور کر دیا تھا۔ وہ آدمی جو زندگی میں معاشی آسودگی کے خواب دیکھ رہا تھا جس کا مسئلہ صرف معاشی آسودگی اور روشن خوابوں کی تعبیر تھی۔ زندگی کا یہ نیا رخ دیکھ کر ہراساں ہو کر رہ گیا۔ آدمی کا آدمی پر سے اعتبار اٹھنے کی یہ داستان بڑی دردناک تھی۔ جس میں شک اور بے اعتباری تھی۔

اس بے اعتباری نے آدمی کو وہمی بنا دیا۔ وہ اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگا۔ اس قسم کے خوف کی عکاسی ۱۹۴۷ء کے بعد لکھنے والے بیشتر افسانہ نگاروں کے یہاں نظر آتی ہیں۔ جس میں انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر سرفہرست ہیں۔ بلوچستان میں افسانہ نگاری کا یہ دور ۱۹۴۷ء کے بعد شروع ہوا۔ اس میں انور رومان کا نام شامل ہے۔

انور رومان نے ۱۹۴۷ء سے قبل بلوچستان میں سکونت اختیار کی تھی اور بلوچستان سے ہی افسانہ نگاری کا آغاز کیا تھا۔ ان کا افسانہ "پری ناگ" جو ۱۹۴۸ء میں "زمانہ" میں شائع ہوا۔ اس کا موضوع مقبوضہ کشمیر ہے جس میں آزادی کے بعد مقبوضہ کشمیر کی آزادی کی تمنا موجزن ہے۔ اس افسانے میں کہانی اور اصل موضوع سے زیادہ تشبیہ و استعارات کا حسن ہے اس افسانے میں خارجی حسن، منظر نگاری، محاکاتی تصاویر پر زیادہ توجہ ہے کہانی کے اعتبار سے افسانہ بہت زیادہ پرکشش نہیں ہے۔

قیام پاکستان کے بعد گورنمنٹ کالج کوئٹہ کا میگزین "بولان" کے پہلا شمارہ اگست ۱۹۴۹ء میں جو افسانے شائع ہوئے ہیں مندرجہ ذیل ہیں۔

"منزلیں" ۔ یہ افسانہ مبارک احمد شاہد نے گورنمنٹ کالج کے میگزین "بولان" میں اگست ۱۹۴۹ء میں

شائع کیا ہے۔ اس افسانے میں زندگی کی منزلیں بیان کی ہیں۔ یعنی صبح دوپہر شام کی طرح زندگی کا کارواں منزلیں طے کرتا ہوا گزر جاتا ہے۔ انسانی زندگی عارضی ہے اور فانی ہے۔ اس کو ثبات نہیں ہے اس افسانے میں حقیقت پسندی کا رجحان غالب ہے۔

اردو افسانے میں حقیقت پسندی کا رجحان تو اس کے آغاز سے ہی نظر آتا ہے۔ پریم چند کے ابتدائی افسانوں میں بھی حقیقت پسندی کا یہ رجحان حب الوطنی کے جذبات سے مملو ہے۔ بعد میں برصغیر میں زندگی میں ٹھہراؤ پیدا ہونے اور ۱۸۵۷ء کے اثرات کم ہونے کے بعد رومانیت کی جس رو نے تقویت پائی اور جن خوابوں نے ذہنوں میں جاگنا شروع کیا تھا ۱۹۴۷ء کے حادثات نے ان کو بری طرح روند ڈالا۔ اور اردو افسانہ پہلے سے زیادہ تلخ حقائق سے آشنا ہوا۔ گورنمنٹ کالج سے یہ پہلا میگزین تھا اس کے لکھنے والوں میں وہ فنی پختگی اور بالیدگی نظر نہیں آتی جس پختگی تک اس عہد کا اردو افسانہ پہنچ چکا تھا۔ لیکن ابتدائی کاوش کے لحاظ سے یہ تحریریں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

"خالہ جان" ۔ یہ افسانہ شمشاد انور نے گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے میگزین "بولان" میں نومبر ۱۹۵۱ء میں تحریر کیا ہے۔

اس میں خالہ جان اور ان کی بھانجی ناز کی کہانی ہے۔ خالہ جان ہر وقت بناؤ سنگھار کرتی رہتی ہیں۔ ان کے کمرے میں میک اپ کا ہر قسم کا سامان موجود رہتا ہے۔ ایک دن وہ بہت زیادہ سنگھار کر کے آئینہ میں اپنے ہر پہلو کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کہ ان کی بھانجی ناز آ جاتی ہے۔ اور وہ جھینپ جاتی ہیں۔ ناز ان سے صرف تین سال چھوٹی ہے اس لیے آپس میں خوب راز و نیاز اور بے تکلفانہ گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ ناز نے خالہ جان کو بتایا کہ وہ ایک نوجوان لڑکے نوید سے محبت کرتی ہے۔ خالہ جان نے بھی اسے بتایا کہ وہ شاہد کو چاہتی ہیں' بلکہ ا آج ساڑھے دس بجے گھر آئے گا۔ ناز خالہ جان کے پاس جب اچانک ساڑھے دس بجے جاتی ہے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے کہ وہاں نوید کھڑا مسکرا رہا ہے۔

شمشاد انور نے اس افسانے میں محبت کے روایتی انداز اور مردوں کے ہرجائی پن کی عکاسی کی ہے۔ جنسی حوالے سے اس میں فرائڈ کے خیالات اثر انداز ہیں۔ رجحان کے اعتبار سے یہ ایک اصلاحی افسانہ ہے۔

"نیا ڈولی جائے" ۔ یہ افسانہ مسافر سیفی نے رسالہ "معلم" میں نومبر ۱۹۵۰ء میں لکھا ہے کہانی یوں ہے کہ خالق کے والدین بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔ بوڑھی والدہ کی دیکھ بھال اور ساری گھریلو ذمہ داریاں اس کے

سر پر تھیں۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد اسے محنت و کوشش کے بعد ایک ڈاکخانے میں نوکری مل جاتی ہے۔ چھ ماہ بعد پوسٹ ماسٹری کا امتحان پاس کر کے ایک قصبہ کے ڈاکخانے کا انچارج بن جاتا ہے۔ اور خوشحال زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اسی دوران گاؤں کی ایک خوبصورت لڑکی نسیمہ سے اسے محبت ہو جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔ لیکن نسیمہ کے والد روپے کے لالچ میں ایک پچاس سالہ بوڑھے سے اس کی شادی طے کر دیتا ہے۔ خالق یہ سب کچھ سن کر پاگل ہو جاتا ہے۔ نسیمہ سخت پریشان اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے سسکیاں بھر رہی ہے اس کے والد اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہتے ہیں۔

(۱) "اٹھو وقت ہو گیا ہے۔ کتنی دیر سے تجھے ڈھونڈ رہا ہوں۔ چلو بیٹی اٹھو۔ زندگی کے دن بڑی خوشی سے بسر کرو گی۔ میری اچھی بیٹی۔ بہت مال دار ہے وہ جنت کے مزے لوٹو گی" !!!!

افسانے کے اس حصے میں والدین کی دولت سے محبت اور طمع کی تصویر دل خراش انداز میں پیش کی گئی ہے۔ دراصل ہندوستان کا یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کے لوگ عسرت اور تنگدستی کا شکار تھے خاص طور پر دیہاتی زندگی زیادہ مفلوک الحال تھی۔ اس لیے والدین روپے کے لالچ میں اپنی لڑکیوں کی شادیاں عمر رسیدہ مردوں سے کر دیا کرتے تھے۔ اس افسانے میں اس زمانے کی جہالت اور غربت کو پیش کیا گیا ہے۔ رجحان کے اعتبار سے یہ افسانہ رومانی اور اصلاحی رجحان کا حامل ہے۔

"شاہ ایران کی عدل پروری" ۔ یہ افسانہ عبدالحکیم تارن نے رسالہ "معلم" سریاب کوئٹہ ماہ جون ۱۹۵۲ء میں تحریر کیا ہے۔

کہانی یوں ہے کہ ایران کے دارالخلافہ سے تقریباً ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر ایک شہر میں حمید نام کا ایک غریب آدمی رہتا تھا اس کی شادی ایک بہت حسین لڑکی زہرہ خانم سے ہو گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ ایک دن شہر کا حاکم اعلیٰ وہاں سے گزر رہا تھا وہ زہرہ خانم کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اس نے اس سے شادی کرنے کے لئے حمید کو مجبور کیا تو حمید نے شاہ ایران کو تمام حالات سے مطلع کر دیا۔ اس نے اس شہر میں آ کر حاکم اعلیٰ کو پستول سے ختم کر دیا۔

اس افسانے میں بادشاہ وقت کی عیاشی، ظلم اور جبر کی داستان ہے۔ یہ رنگ اردو ادب میں داستانوی اسلوب میں نظر آتا ہے یا کلاسیکی قدیم کہانیوں میں اس قسم کے واقعات موجود ہیں۔ اس افسانے میں ظلم اور جبر

۱۔ "نیا ڈولی جائے" مسافر سیفی رسالہ "معلم" نومبر ۱۹۵۰ء ص ۲۵۔

کی ایک ایسی کہانی ہے جو اقتدار کے نشے میں چور کرداری کی وساطت سے سامنے آتی ہے۔ یہ کردار آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ زمانہ بدل گیا۔ رسوم و رواج اور حکومت کے انداز بدل گئے لیکن انسانی زندگی میں ہونے والے ظلم کے انداز نہیں بدلے۔

"یہ دنیا والے" ۔ یہ افسانہ عبدالرحمان کرد نے "معلم" میں فروری ۱۹۵۱ء میں لکھا ہے کہانی یوں ہے

ایک غریب بلوچی لڑکی مہ ناز جس کی عمر دس سال ہے اس کے والد نے ساٹھ سالہ سلطان خان ایک سیٹھ جس کی گاؤں میں بہت عزت تھی اور کوئی بھی اس کی بات رد نہیں کر سکتا تھا اس کے ساتھ مہ ناز کی شادی دو ہزار روپے کے عوض میں طے کر دی تھی۔

پورے گاؤں میں شادی کی تیاری بڑی دھوم دھام سے کی گئی۔ ممتاز کی ماں کو جب بیٹی کی کم سنی کا خیال آیا تو رونا شروع کر دیا لیکن اس کے باپ نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

(ا) "ہوش میں آؤ مہ ناز کی ماں" دو ہزار روپیہ معمولی چیز نہیں معلوم نہیں ہم غریب ہیں؟ نادان تو نہیں جانتی کہ بلوچی جرگہ کی رو سے ایک تومند نوجوان بلوچ کا خون بہا صرف ڈیڑھ ہزار روپیہ ہے۔ اور ہمیں تو مہ ناز کے لیے دو ہزار روپیہ ہاتھ آرہے ہیں۔ خاموش اس سے زیادہ اور کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ سلطان خان جیسے امیر کی دامادی کا شرف ہمیں حاصل ہوگا۔"

اس افسانے میں غربت و افلاس سے پیدا ہونے والے مسائل پیش کئے گئے ہیں اور جہالت و غلط قسم کی رسومات کی نشاندہی کی گئی ہے جس کی وجہ سے معصوم زندگیاں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ اس میں معاشی اور جنسی حوالے سے مارکس اور فرائڈ کے اثرات بھی حاوی نظر آتے ہیں۔ رجحان کے اعتبار سے ایک اصلاحی افسانہ ہے۔

"نمائش کے بعد" ۔ یہ افسانہ نون بھائی مرادآبادی نے رسالہ "معلم" فروری ۱۹۵۳ء میں تحریر کیا ہے۔

اس میں کہانی یوں ہے کہ نون بھائی گاؤں واپس آتے ہیں۔ تو انہیں ماضی یاد آجاتا ہے۔ جب وہ نمائش دیکھنے آئے تھے۔ اس وقت نمائش کی رونق لوگوں کا ہجوم مرد عورت بچے بوڑھے سب رنگ برنگ لباس میں ملبوس تھے۔ زندگی میں ایک حرارت تھی۔ اور سارا ماحول ایک سحر آلود لگتا تھا۔ اور پھر وہاں رانا ورائٹی شو کے نام سے ایک تھیٹر بھی تھا۔ جس میں مس کاذمیری نے کلاسیکل ڈانس سے شو کا افتتاح کیا۔ یہ حسینہ اپنی تمام تر

ا۔ "یہ دنیا والے" عبدالرحمان کرد، رسالہ "معلم" فروری ۱۹۵۱ء، ص ۲۳۔۲۴

رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز تھی۔ اس کے رقص اور سریلی آواز سے سب مدہوش ہوئے جاتے تھے۔ اسے جب پہلی مرتبہ دیکھا تو اس میں رعنائیاں اور حسن قیامت ڈھا رہا تھا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اس میں وہ رعنائی اور حسن و تازگی کم ہوتی چلی گئی۔

(ا) "مگر تمہاری ایسی دلکش آواز نہ تھی۔ اور نہ ناچتے وقت بدن میں وہ گداز تھا۔ آنکھوں میں وہ حسین اشارے نہ تھے اور نہ ہی بکھرے بکھرے گیسو تھے کہ فضا لوٹ جاتی۔ اور پھر اچانک تمہاری سریلی آواز فضا میں گونجنے لگی مگر اس مرتبہ آواز میں کمزوری تھی۔ اور بدن میں وہ چستی اور لچک بھی نہ تھی۔ تم اب بھی کمزور تھیں۔ اور اس قابل نہ تھیں کہ اپنے فن کا بخوبی مظاہرہ کر سکتیں۔ مگر پھر تمہیں یہ سب کچھ کرنا تھا۔ ناچنا تھا گانا تھا۔ اس لئے کہ تم ایسا کرنے پر مجبور تھیں۔ یا بے بس کر دی گئی تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ کبھی تم بھی ماں باپ کی نور نظر تھیں۔ مگر کسی کی ہوس پرستی اور خود غرضی نے تمہیں اس حالت تک پہنچا دیا۔ کہ آج تم اپنا جسم سر بازار تک بیچنے پر مجبور ہو۔ اپنی خواہشات و جذبات اور اپنے ارمان سب کے سب ماضی کے لاشعور میں دفن کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ اور اب منیجر کے لیے صرف روپیہ بنانے کی مشین بن کر رہ گئی ہو۔ اور آخر ایک دن کسی کے ہاتھوں فروخت کر دی جاؤ گی۔ اور وہ تمہارے نرم اور گداز جسم سے رس چوستا رہے گا۔ اور جب تم اس کے کام کی نہ رہو گی تو شاید ان بازاری کے اضافے کے لیے چھوڑ دی جاؤ گی۔ جہاں سے ایک دن تم کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہو کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر لو گی۔"

اس افسانے میں نون بھائی مرادآبادی نے سماجی مسائل کی عکاسی کی ہے۔ اور اپنے نظریات پیش کر کے سماج کی دکھتی رگ کو چھیڑا ہے۔ معاشی اور جنسی مسائل کے حوالے سے مارکس اور فرائیڈ کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ یہ افسانہ رومانی اور اصلاحی رجحانات کا حامل ہے۔

"حنا بندی" ۔ یہ افسانہ غلام نبی افغانی نے رسالہ "معلم" ستمبر ۱۹۵۳ء میں تحریر کیا ہے۔

اس افسانے میں ایک دلہن کو عین شادی کے موقعہ پر اس کا والد دلہن کے دیور کے ہاتھ چھ ہزار روپے کے عوض فروخت کر دیتا ہے۔ خون کی ہولی ہوتی ہے۔ دولہا اور محبوب ایک دوسرے کو مار دیتے ہیں۔ اور

ا۔ "نمائش کے بعد" نون بھائی مرادآبادی۔ رسالہ "معلم" فروری ۱۹۵۳ء ص ۲۳۔۲۶

دلہن بھی اپنے آپ کو ختم کرلیتی ہے۔

(۱) "وہ دنیا والوں کو گھور رہی تھی۔ اس کے والد نے اسے بیچ کر چھ ہزار روپے کھرے تو کرلیے مگر انسانیت کو ایک عظیم دھکا لگا۔ اس کا محبوب بے جان۔ اس کا دولہا راہی ملک عدم اور ساتھ کئی اور بے گناہ بندے زخمی۔ شادیانے بجتے بند ہوگئے تھے فضا پر سکوت طاری تھا۔ نیلا آسمان سوچ رہا تھا۔ کہ یہ پہاڑی لوگ لڑکیوں کو بیچتے کیوں ہیں۔؟"

اس افسانے میں پہاڑی لڑکیوں کے مسائل بتائے گئے ہیں اور قبائلیوں کے ظلم و ستم۔ جہاں عورت کو بے زبان جانور سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے۔

"خدمت کا صلہ"۔ یہ افسانہ شاداں امرتسری نے رسالہ "معلم" مئی ۱۹۵۴ء میں تحریر کیا ہے۔

کہانی یوں ہے کہ اس میں ایک کتا کسی کار کے نیچے آگیا تھا اور اس کے اگلے دو پنجے بری طرح زخمی ہوگئے تھے۔ اس میں سے خون بہہ بہہ کر سڑک پر گر رہا تھا اور وہ بری طرح چیخ رہا تھا خون زیادہ بہہ جانے سے اسے نقاہت بھی ہو رہی تھی۔ ہر آنے جانے والے راہگیر کو دیکھتا تھا۔ جیسے وہ کسی کی تلاش میں ہو۔ جیسے ہی اسے مالک افضل نظر آیا وہ خوش ہوگیا اور اس کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیا افضل نے اسے گھور کر دیکھا اور جھٹکا دے کر دور کردیا یہ سوچ کر کہ کتے کے خون سے اس کی پینٹ اور جوتے خراب ہو جائیں گے۔ کتا افضل کو ایسی نظروں سے دیکھتا رہا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ ساری عمر کی خدمت اور چوکیداری کا یہ صلہ ہے۔ پھر سسکیاں لے کر ختم ہوگیا۔

اس افسانے میں شاداں امرتسری نے ان سماجی قدروں کی نشاندہی کی ہے جو آج کل مفقود ہیں۔ اس میں کتے کا کردار اتنا حقیقی ہے کہ مالک کے ساتھ گزرے ہوئے تمام واقعات سامنے آجاتے ہیں اس میں بعض تلخ حقائق کا تجزیہ بھی بڑے سفاکانہ انداز میں کیا ہے بے حسی، خود غرضی، عیاری، طاقت کا ناجائز استعمال ایسے حقائق ہیں۔ جو انسان کے اندر کسی گوشے میں چھپے ہوتے ہیں۔ افسانے میں ان ہی حقائق کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اس میں شاداں امرتسری کا فنی شعور نظر آتا ہے۔ رجحان کے اعتبار سے اخلاقی رجحان کا حامل ہے۔

"آرزوؤں کا خون"۔ یہ افسانہ زاہد احمد صدیقی نے "معلم" اگست میں ۱۹۵۴ء میں تحریر کیا ہے۔

کہانی یوں ہے کہ ساجدہ شاہد سے محبت کرتی ہے۔ لیکن اس کا وہ اظہار نہیں کرتی ہے۔ شاہد بھی اسے بہت چاہتا ہے۔ ایک دن شاہد نے ساجدہ سے اظہار محبت کیا اور ساجدہ سے شادی کا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے شاہد کو

۱۔ "حنا بندی" غلام نبی افغانی، رسالہ "معلم" ستمبر ۱۹۵۳ء، ص نمبر ۱۸۔

بتایا کہ یہ شادی کبھی نہیں ہو سکے گی کیونکہ اس کے والدین نے اس کی شادی طے کردی ہے۔ اور وہ شرم و حیا کی وجہ سے والدین سے کچھ نہیں کہہ سکے گی۔ وہ اپنی زندگی تو تباہ کرسکتی ہے اپنے ارمانوں کا خون کرسکتی ہے لیکن اپنی اس حیا کو ختم نہیں کرسکے گی۔ پھر وہ شاہد سے کہتی ہے۔

(۱) "لیکن شاہد محبت دل سے ہوتی ہے جسم سے نہیں۔ پاک محبت میں جنس کی چاہ کوئی معنی نہیں رکھتی..... اور شاید تم یہ نہیں جانتے کہ انسان کی پہلی شادی اس کی محبت ہی ہوتی ہے۔ میرے دل کا سودا تو تم سے ہوگیا ہے۔ اب جسمانی سودا جس سے بھی ہو جائے۔ اس سے تمہیں کیا غرض۔؟"

اس افسانے میں لڑکیوں پر ہونے والے اس ظلم کی کہانی ہے جہاں اسے انسان نہیں سمجھا جاتا جہاں اس کے جذبات و احساسات کا احترام نہیں ہوتا۔ اسے اپنی پسند اور آزادی کے ساتھ زندہ رہنے کا حق نہیں دیا جاتا۔ یہ افسانہ معاشرتی خامیوں اور سماجی مسائل کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔

"سوالیہ نشان"۔ یہ افسانہ ماہنامہ "کوہسار" کوئٹہ مارچ ۱۹۵۳ء میں اقبال سلمان نے تحریر کیا ہے۔

اس افسانے میں کہانی یوں ہے کہ انور کی شادی کلثوم سے ہوتی ہے۔ ان کا ایک بیٹا روفی ہے۔ لیکن انور ایک لڑکی فریدہ کو پسند کرتا ہے اور اس کے خیالوں میں رہتا ہے۔ اس طرح کلثوم بھی محمود کو پسند کرتی ہے۔ لیکن دونوں ہی اپنے بیٹے عرفی سے بہت پیار کرتے ہیں۔ یہ دونوں کے درمیان ایک ایسا مضبوط بندھن ہے جسے کوئی نہیں توڑ سکتا۔ اس لیے دونوں کے خواب سوائے سوالیہ نشان کے آگے کچھ نہیں سوچ سکتے۔

(۲) "ہو سکتا ہے کہ دوسری سوتیلی ماں کی طرح تم بھی اپنے سوتیلے بیٹے کو ظلم و ستم کا نشانہ بناؤ۔ اور وہ بچہ جس میں میں اپنی ساری شخصیت منتقل کردینا چاہتا ہوں۔ تمہارے بس میں آکر ہمیشہ کے لیے برباد ہو جائے۔ آج میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ کل تم اس محبت پر ڈاکہ ڈال سکتی ہو۔ باپ کو بیٹے کا دشمن بنا سکتی ہو۔ نہیں مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ بس کلثوم ہی کے ساتھ نباہ کرلوں گا۔ میں اپنے بیٹے کی حسرتوں کا خون نہیں کرنا چاہتا۔"

اس افسانے میں محبت اور اپنی پسند کا گلا گھونٹ کر معاشرتی قوانین کی لاج رکھنے کی کوشش حاوی ہے۔ اس قسم کے حالات سے جس قسم کی نفسیاتی پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں۔ جس طرح زندگی کی خوشیاں چھن جاتی ہیں۔ اور اس شدید جذباتی بحران سے گزر کر آدمی پر کیا بیتتی ہے اور صبر کا دامن تھام کر وہ کس طرح زندگی

۱۔ "آرزوؤں کا خون" زاہد احمد صدیقی، "معلم" اگست ۱۹۵۴ء، ص نمبر ۲۰۔
۲۔ "سوالیہ نشان" اقبال سلیمان، ماہنامہ "کوہسار" کوئٹہ، مارچ ۱۹۵۳ء، ص نمبر ۲۴۔

سے سمجھوتہ کرتا ہے۔ جذبات واحساسات اور رومانی رویوں سے تشکیل شدہ یہ کہانی جنسی مسائل سے جنم لینے والی کہانی ہے۔ یہ وہ دور ہے جب عصمت چغتائی نے عورت کے جنسی جذبوں کی کہانیاں لکھ کر جرات مندی کا مظاہرہ کیا اور معاشرے کو یہ احساس دلایا کہ عورت بھی گوشت پوست کی بنی ہوئی ایک ہستی ہے اس کے اندر بھی وہی جذبے اور احساسات ہیں جو مردوں میں ہیں اسے بھی پسند اور ناپسند کا حق ہے۔ عورت پر جتنے ظلم اور جبر جنسی حوالے سے کئے گئے شرم کے نام پر عورت کو جس طرح ظلم کے خلاف چپ رہنے پر مجبور کیا گیا یہ افسانے اس ظلم کی کہانیاں ہیں۔

ہم نے بلوچستان میں چھپنے والے اخبار پاسبان کے افسانے اور مختلف رسائل زمانہ، معلم، بولان، کوہسار کے افسانوں کا جائزہ لیا۔ یہ سب افسانے بلوچستان میں غربت اور افلاس سے پیدا ہونے والے مسائل پیش کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں سیاسی نکتہ نظر سے آزادی کی تمنا کا اظہار ہے اور یہ حقیقت سے زیادہ جذبات سے مملو ہیں لیکن یہ افسانے بلوچستان میں افسانہ نگاری کے ابتدائی نقوش ہونے کی وجہ سے تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

پروفیسر ڈاکٹر فاروق احمد کی کتاب

"بلوچستان میں اردو ادب" چھپ کر مارکیٹ میں آگئی ہے۔ یہ بلوچستان میں تاریخ اردو ادب کے حوالے سے ایک اہم کتاب ہے۔ اس سے قبل بلوچستان میں اردو ادب کے حوالے سے کوئی کام اب تک نہیں ہوا۔ ڈاکٹر فاروق احمد کی یہ کتاب بلوچستان میں اردو ادب کے حوالے سے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ ایم اے اردو کے نئے سلیبس میں آٹھویں پیپر کے مطابق یہ ایک بہت اہم کتاب ہے۔

دوسرا باب

بلوچستان میں اردو نثر اور تاریخی پس منظر اخبار و رسائل

بلوچستان میں اردو نثر کے ارتقاء اور فروغ میں صحافت کا اہم کردار رہا ہے۔ اس لئے بلوچستان میں اردو نثر کی ترقی و ترویج کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بلوچستان میں چھپنے والے مختلف اخبارات کا مختصر سا خاکہ پیش کیا جائے۔

انگریزوں نے بلوچستان پر ۱۸۷۶ء میں قبضہ کیا تھا اس وقت بلوچستان میں انگریزوں کے آمد کے وقت کوئٹہ اور قلات ریجن میں اردو انگریزی دونوں زبانیں وجود میں آچکی تھیں۔ انگریزی چونکہ حکمرانوں کی زبان تھی اس لئے شروع میں اخبار انگریزی میں شائع ہوتے تھے پھر اردو میں جاری ہونے لگے اور پھر آہستہ آہستہ زیادہ تر اخبار اردو ہی میں شائع ہوتے تھے۔

انگریزوں کے دور میں وادی بولان یعنی بلوچستان میں شروع میں صحافت کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اس وقت بلوچستان میں غربت اور پس ماندگی کا دور دورہ تھا۔ انگریز جو ہندوستان میں تاجر کے روپ میں آئے یہاں کی سیاسی کمزوریوں اور ہندوستان کے حکمرانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں غاصبانہ تسلط کرلیا تھا۔ اس تسلط کو برقرار رکھنے کے لئے وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ یہاں کے مقامی لوگوں میں سیاسی شعور بیدار ہو اور وہ علم و آگاہی کی منزلیں عبور نہ کرسکیں اس لئے انہوں نے صحافت پر پابندی عائد کردی تھی اور بعض اوقات تو اخبار کا پڑھنا بھی قابل احتساب عمل قرار پاتا تھا۔

بقول کمال الدین احمد۔

(۱) "اور تو اور ہندوستان کے دوسرے شہروں سے جو جو اخبارات آتے تھے مثلاً زمیندار، سیاست، انقلاب، ویربھارت، تیج، پرتاب وغیرہ ان کے پڑھنے والے بھی سی آئی ڈی کی نظروں میں رہتے تھے۔ شہر میں تقسیم کرنے سے پیشتر ان اخباروں کی پڑتال کرلی جاتی تھی۔ بعض دفعہ اخبار بھی ضبط کرلئے جاتے تھے۔ سی آئی ڈی کے لئے کسی شخص کو اخبار پڑھتے دیکھ لینا بہت بڑی خبر ہوا کرتی تھی۔ سیاسی باتیں کرنا بھاری جرم تھا۔ دراصل وہ دور "گستاپو" کا دور تھا۔ ان حقائق کی روشنی میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں کی صحافت کیا

۱۔ "صحافت وادی بولان میں" کمال الدین احمد، بلوچی اکیڈی، ص نمبر ۶۹

تھی اور کیا ہو سکتی تھی۔"

۱۹۳۵ء میں زلزلے کی تباہی کے بعد بھی انگریزی حکومت کی جابرانہ پالیسیاں اور یہاں کے عوام کو اپنا غلام سمجھنے کا رویہ اسی طرح قائم رہا۔ ان کے عہد میں آزادی رائے پر سخت پابندی عائد تھی۔ تعلیمی پالیسی میں بھی اس بات کا اہتمام کیا گیا تھا کہ یہاں کے عوام ذہنی طور پر خود کو انگریزوں کا غلام سمجھیں۔ تعلیم کا مقصد محض کلرک پیدا کرنا تھا۔ تاکہ ان کے قائم کردہ اداروں کو برصغیر کے عوام کم سے کم اجرت پر مہیا ہو سکیں۔ انہوں نے تعلیمی پالیسی اس قسم کی مرتب کی تھی کہ یہاں کے باشندے خود کو کبھی بھی ایک آزاد قوم تصور نہ کر سکیں۔ اور نہ ان میں تخلیقی صلاحتیں اجاگر ہوں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے آزادی صحافت پر سخت پابندیاں عائد کی تھیں۔

بہت سے اخبارات جس میں حریت پسندانہ رویہ تھا یا ایسی خبریں چھپتی تھیں جن میں آزادی کے لئے خواب یا حقائق کا ادراک پیدا ہو تو ایسے اخبارات کے پڑھنے پر پابندی تھی اگر کوئی حریت پسند ایڈیٹر ایسا اخبار جاری کرتا تو وہ چھپا کر شائع کیا جاتا۔ اس قسم کے اخبار کا مطالعہ کرنا بھی جرم تھا۔

کمال الدین احمد نے بلوچستان کی صحافت کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا دور ۱۸۸۸ء سے ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء تک

اس دور میں ۱۹ اخبار و رسائل شائع ہوئے تھے جن میں سے ۱۶ انگریزی کے اور تین اردو کے تھے۔

"مستمل بلوچستان ایڈورٹائزر" "بلوچستان گزٹ" "بارڈر ڈیکلی نیوز" "ڈیلی بلوچستان گزٹ" "بلوچستان ہیرلڈ" اور "کوئٹہ نیوز" انگریزی کے اخبار تھے۔

"راست گو" یہ پہلا اردو روزنامہ تھا جو جنگ عظیم کے دوسرے دن سے جاری ہوا۔ اس میں بمبئی سے جنگ کی خبریں فراہم کی جاتی تھیں۔

"قندیل خیال" یہ اردو رسالہ علمی وادبی خبروں کی اشاعت کیلئے ۱۹۰۸ء میں لورالائی سے جاری ہوا۔ ایڈیٹر احسان "قندیل خیال" کی ترتیب و تدوین میں بہت جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے۔

"ماہنامہ نوشیرواں" یہ علمی وادبی ماہنامہ ۱۹۳۰ء میں جاری ہوا اس کے ایڈیٹر صحرائی سروردی تھے۔

دوسرا دور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۶ء تک

اس عہد میں نئے نئے اخبار جاری ہوئے ۱۹۳۶ء میں مولانا ظفر علی خاں اور سر عبداللہ ہارون کی جدوجہد

سے بلوچستان میں پریس کا آغاز ہوا۔ اس دور میں پہلے دور کے مقابلے میں دوگنا سے زائد اخبارات جاری ہوئے۔ بیس اخبار و رسائل میں سے صرف تین انگریزی کے تھے اور سترہ اخبار و رسائل اردو کے تھے۔ "ایڈورٹائزر" "کوئٹہ ٹائمز" انگریزی کے تھے اور دی "نیوز کوئٹہ" انگریزی اور اردو میں جاری ہوئے۔

اردو کے سترہ اخبار و رسائل میں سے اہم اخبار و رسائل درج ذیل ہیں۔

"استقلال" یہ ہفتہ وار اردو اخبار ۱۹۳۸ء میں عزیز پریس سے جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر قدوس صہبائی تھے۔ اس میں بلوچستان کے سیاسی و اقتصادی مسائل پر تبصرہ کیا جاتا تھا۔

"پاسبان" یہ ہفت روزہ اخبار ۱۹۳۹ء میں جاری ہوا۔ بعد میں پندرہ روزہ ہو گیا اس کے ایڈیٹر مولانا محمد عبداللہ ہیں۔

"الاسلام" یہ ہفت روزہ اخبار ۱۹۳۹ء میں مولانا عبدالکریم کی ادارت میں بلوچستان کے مسلمانوں کو لیگ کے پیغام سے آگاہ کرنے کے لئے جاری ہوا۔

"زمانہ" ۷ جون ۱۹۴۷ء میں مسٹر برکت علی آزاد نے ہفتہ وار اردو اخبار جاری کیا تھا جو بعد میں روزنامہ ہو گیا تھا

تیسرا دور ۱۹۴۷ء سے دسمبر ۱۹۶۴ء تک

اس دور میں صحافت نے پہلے دور سے زیادہ ترقی کی تھی کل باسٹھ اخبار و رسائل میں انسٹھ اخبار و رسائل اردو کے تھے تین اخبار انگریزی کے تھے۔

"پاکستان مرر" "بولان ایکسپریس" "اکیڈمی آف اسلامک سٹڈیز نیوز بلیٹن"۔

اردو کے انسٹھ اخبار و رسائل میں سے چند اہم اخبار و رسائل کا جائزہ درج ذیل ہے۔

"میزان" پہلا ہفتہ وار اخبار یکم ستمبر ۱۹۴۷ء میں مولانا ابوالجمیل عبدالکریم نے جاری کیا۔

"کلمتہ الحق" یہ ہفتہ وار اخبار ۱۹۵۰ء میں سبی سے جاری ہوا۔ اس کے مدیر عطا محمد مرغزانی تھے۔

"رہبر نسواں" یہ ماہنامہ ۱۹۴۸ء میں مسٹر اللہ رکھا جالی نے بلوچستان کی خواتین کے لئے جاری کیا۔ جو بعد میں پندرہ روزہ ہو گیا تھا۔

"کوہسار" مولوی عبدالعزیز نے ۱۹۵۰ء میں ماہنامہ جاری کیا تھا پھر پندرہ روزہ ہو گیا۔ اب ہفت روزہ

ماخذ۔ "صحافت وادئی بولان میں" کمال الدین احمد، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

"بلوچستان میں اردو" ڈاکٹر انعام الحق کوثر

ہے اس کا مقصد قومی یکجہتی محبت ایثار اور باہمی توازن کے جذبات ابھارنا تھا۔

"بولان" یہ سہ ماہی رسالہ گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ اس کے مدیران اقبال الرحیم مسعود الرؤف اور لطیفہ صدیقی تھے اس رسالے کا مقصد بھی طلباء میں علمی و ادبی ذوق پیدا کرنا تھا۔

"نعرہ حق" یہ اخبار ۱۹۵۲ء میں سکھر سے کوئٹہ آیا تھا۔ اور یہ کوئٹہ اور سکھر سے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ جولائی ۱۹۶۲ء میں محمد گلزار کی زیر نگرانی روزنامہ ہوگیا تھا۔

"زرغون" گورنمنٹ گرلز کالج کوئٹہ کا یہ اردو انگریزی رسالہ جون ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹر مس یوسف اور تاجدار بانو کی نگرانی میں شائع ہوا۔

ہم بلوچستان سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان اخبارات کے مطالعہ سے اردو کو فروغ دینے میں نمایاں خدمت سرانجام دی ہیں۔

بلوچستان میں اردو کی ترقی و ترویج میں تعلیمی اداروں کا بھی کلیدی کردار رہا ہے۔ بلوچستان میں بولی جانے والی یہاں کی مقامی زبانیں بلوچی' براہوی اور پشتو تھیں۔ لیکن دینی مدارس' اسکول اور کالجوں میں اجتماعی ط پر ایک زبان اردو ہی تھی۔ جو نہ صرف ان تمام زبانوں کے بولنے والوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھی ذریعہ تعلیم میں بھی وہ مرکزی حیثیت کی حامل رہی۔ بلوچستان کے بعض علاقوں میں ابتداء میں فارسی زبان اہمیت حاصل تھی۔ لیکن بعد میں اردو کے عام فہم ہونے کی خصوصیت کے سبب بہت جلد اس نے فارسی کی لے لی۔ کیونکہ یہاں اردو ہی وہ واحد زبان تھی جو انگریزی اور فارسی کے مقابلے میں سہل اور دلوں میں گھر کرنے والی زبان کا درجہ رکھتی تھی جس نے برصغیر میں یہاں کی زبانوں اور یہاں کے ماحول میں جنم لیا تھا۔ بلوچستان میں اردو کی ترقی اور ترویج میں یہاں کے تعلیمی اداروں اخبارات' رسائل اور صحافت نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد اردو افسانہ

اس سے پہلے باب میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان بیسویں صدی کے درمیانی عرصہ میں سیاسی کشمکش بھر میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کے اثرات اور ہندو مسلم تنازعات کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ خصوصاً مسل سیاسی' معاشی اور معاشرتی سطح پر انتہائی زبوں حالی کا شکار تھا۔ انہیں اس مسائل سے نبرد آزما ہونے کے قوت' فکر اور شعور کی ضرورت تھی۔ تحریک سرسید نے ایسے نامساعد حالات میں مسلمانوں کو ذہنی و علمی ط

بیدار کیا۔ ان کے اس شعور کے اثرات ادب پر بھی پڑے۔

برصغیر میں انگریزوں کی آمد اور تسلط کے ساتھ ساتھ ان کی تہذیب و ثقافت کے اثرات ہندوستان کی تمدنی زندگی پر اثرانداز ہوئے اردو ادب کو انگریزی ادب نے متاثر کیا۔ اردو ادب میں پہلے نثر میں مذہبی واقعات پر مشتمل مضامین اور داستانیں اور شاعری میں غزل' قصیدہ اور مرثیہ کی اصناف رائج تھیں۔ انگریزی کے زیر اثر اردو ادب میں نثر اور شاعری دونوں حوالوں سے تبدیلی رونما ہوئی شاعری میں نظم جدید کا آغاز ہوا۔ جس میں عشق و عاشقی کے علاوہ حقیقت پسندانہ موضوعات شامل ہوئے اور نثر میں اردو ادب' ناول' افسانہ' ڈرامہ' مضمون نگاری جیسی اصناف سے روشناس ہوا۔

اردو افسانے کی ابتداء بیسویں صدی میں ہوئی اور اردو افسانہ نگاری میں سجاد حیدر یلدرم' نیاز فتح پوری' مجنون گورکھ پوری' ل احمد اور سلطان جوش کے افسانے رومان پرور اور آسودگی کی فضا کے ساتھ ساتھ حقیقت کی طرف مائل ہوئے۔ ان کے ساتھ ساتھ پریم چند کی حقیقت نگاری نے اصلاح معاشرہ اور شعور کا احساس پیدا کیا۔ اس دور کے افسانوں میں رومانیت کے ساتھ ساتھ سماجی شعور بھی ابھرا۔ لیکن ۱۹۳۰ء تک اردو افسانے میں رجحان کے اعتبار سے کوئی نمایاں تبدیلی نظر نہیں آتی۔ اردو افسانہ ایک خاص رویے' رجحان اور منزل پر آکر جیسے ٹھہر گیا تھا۔ زندگی آگے بڑھ رہی تھی اس میں حالات کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ عالمی سیاست کا رخ تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا۔

مغربی تعلیم نے فکر کو نئے زاویے دیئے نئے رجحانات سے روشناس کرایا تھا وہ نوجوان طبقہ جس نے باہر کے ملکوں میں تعلیم حاصل کی تھی جو وہاں کی سیاست' تہذیب اور نئے افکار و نظریات سے فیضیاب ہوئے تھے انہوں نے اپنے ملک کی سیاسی بے راہ روی اور معاشی ناہمواری اور ناانصافی سے پیدا ہونے والی یہاں کی گھٹن کو شدت سے محسوس کیا۔ وہ اپنے ملک میں غیروں کے تسلط سے پیدا ہونے والی سیاسی گھٹن' اظہار رائے پر پابندی سے بھی نالاں تھے۔ اور اپنے ملک میں پھیلی ہوئی غربت اور جہالت سے پیدا ہونے والی فضا کو بھی ختم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے ۱۹۳۱ء میں "انگارے" نامی ایک چھوٹی سی کتاب شائع کی۔ باوجود اس کے کہ انگارے کے افسانے زبان و بیان کے اعتبار سے حد اعتدال سے گرے ہوئے تھے۔ اور فنی اعتبار سے ان میں بہت سی خامیاں تھیں۔ لیکن اس کتاب کی اشاعت نے اردو افسانہ نگاری میں انقلابی تبدیلی پیدا کی۔

افسانوں میں اسی قسم کے رجحانات اور مسائل کو اپنے انداز فکر کے ساتھ پیش کر رہے تھے جس کی وجہ سے افسانوں میں تنوع اور رنگا رنگی پیدا ہو گئی تھی۔ اور ان مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو گئی تھی۔

اس عہد کی افسانہ نگاری میں موضوعات اور رجحانات کے اعتبار سے تنوع اور رنگا رنگی تھی۔ زندگی کے مختلف پہلو معاشی، سیاسی، جنسی اور معاشرتی رجحانات کے ساتھ افسانوں کے موضوعات تھے۔ جس میں زندگی کی بشارت اور خواب تھے۔ یہ عہد اردو افسانہ نگاری کا عہد زرین کہا جاسکتا ہے لیکن فسادات نے نہ صرف ہندوستان کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی جمی جمائی اکائی کو توڑ دیا بلکہ انسان کے ان خوابوں کو بھی منتشر کردیا جن کے تحت وہ معاشرتی، معاشی اور جنسی زندگی کے حوالے سے خوبصورت خواب بن رہا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بہت عرصہ تک فسادات کے موضوعات افسانوں میں گونجتے رہے۔ فسادات کے بطن سے پیدا ہونے والی گہری گہرائی کہانیوں سے اس عہد کے بہت سے افسانہ نگاروں نے فیض اٹھایا۔ ان میں کچھ افسانے ایسے بھی لکھے گئے جن میں سچائی اور معنوی گہرائی تھی اور وقتی موضوعات پر مشتمل ہونے کے باوجود ایک دائمی فنی حیثیت کے حامل ہیں۔

قیام پاکستان ۱۹۴۷ء کے بعد کی اردو افسانہ نگاری کے متعلق انتظار حسین اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

(۱) "تقسیم کا اثر ہمارے ذہنوں پر بہت گہرا پڑا ہے سماجی فضا اور سیاسی ماحول یکلخت بدل گیا۔ انگریزوں کا اثر ضرور رہا لیکن انگریز حاکم سامنے سے ہٹ گئے ادھر ہمیں یہ احساس دلایا گیا کہ اب قومی حکومت ہے اس طرح ہم اپنے طریق کار متعین نہیں کرپائے پہلے ہندو سکھ اور مسلمان اکٹھے تھے سماجی تانا بانا تھا۔ استحکام تھا زندگی میں تسلسل تھا۔ اب یہ لوگ بٹ گئے اور ایک طرح کا Social Disinteration کا دور آگیا اور نئے حالات میں لکھنے والوں کو بڑی دقت پیش آئی۔"

۱۹۴۷ء کے تقسیم ہند کے اثرات بلوچستان کی اردو افسانہ نگاری پر

۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستان کے اردو افسانوں پر بہت تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ کیونکہ تقسیم ہند کے باعث لاکھوں افراد بے گھر ہو گئے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کی وجہ سے پورا معاشرہ ایک بحران سے گزر گیا اور انسانوں کی پرسکون زندگی میں ایک انقلاب آگیا۔ وہ جس جگہ اور جس ماحول میں صدیوں سے رہ رہے تھے۔ اسے چھوڑ کر ایک اجنبی ماحول اور نامانوس جگہ پر منتقل ہونا پڑا۔

۱۔ انتظار حسین "نقوش" جلد دوم، ص نمبر ۱۰۵۳۔ افسانہ نمبر۔

ڈاکٹر فردوس انور قاضی اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں۔

(۱) "فسادات نے جمی جمائی تہذیب کو منتشر کردیا۔ پاکستان بننے کے بعد برصغیر دو حصوں میں تقسیم ہوا۔ اور صدیوں کی جمی جمائی تہذیب بھی اپنے علاقے اور ماحول سے بچھڑ کر مختلف علاقوں میں تقسیم ہوئی جس کے سبب وہاں بسنے والے انسانوں پر قیامت گزر گئی۔ انہیں کٹے ہوئے درخت کو بغیر جڑوں کے نئی زمین اور نئے ماحول میں اس طرح جڑنا پڑا جیسے درخت کو بغیر جڑوں کے دوبارہ لگانے کی کوشش کی جائے۔ فسادات کے تحت اکھاڑ پچھاڑ کے تحت ہونے والے دکھ اپنوں سے بچھڑنے کا صدمہ اپنے پیاروں کی قربانی، انسان کے ہاتھوں انسان پر ہونے والے ظلم اور درندگی نے انسان کو منتشر کردیا۔ اس کے وہ خواب جو اس نے صدیوں پر محیط ایک تہذیب اور ثقافت کے تناور درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر بنے تھے بکھر گئے۔"

۱۹۴۷ء کے فسادات کا اثر اردو افسانے پر بھی ہوا۔ اردو افسانہ روزمرہ کے سیاسی حادثات سے متاثر ہوا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جو افسانے لکھے گئے ان میں فنکارانہ حسن کے ساتھ حالات کی سفاکی بھی موجود تھی اور سماجی، معاشی و جنسی موضوعات پر افسانے لکھے گئے۔

پاکستان بننے کے بعد فسادات سے پیدا ہونے والے خونی واقعات نے بہت عرصہ تک افسانہ نگاروں کی تحریروں کو دھندلائے رکھا۔ آہستہ آہستہ ذہنوں سے فسادات گرد چھٹی اور افسانہ نگاروں نے بدلی ہوئی تہذیب اور نئے ملک کے نئے ماحول اور نئے مسائل کا جائزہ لینا شروع کیا جس میں پاکستان بننے کے بعد مہاجروں کی آبادکاری کا مسئلہ سرفہرست تھا اس کے بعد زندگی کے معاشرتی، معاشی اور جنسی مسائل نے لکھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔

اس دور میں برصغیر کی تقسیم کے اثرات انور رومان کی تحریروں میں بھی نظر آتے ہیں۔
انور رومان بلوچستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ برصغیر کی تقسیم سے قبل بلوچستان میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اور اردو افسانے کا آغاز بھی انہوں نے اسی خطے سے کیا تھا۔ وہ ۱۹۴۷ء سے پہلے بھی افسانے لکھتے رہے ہیں۔ اس سے پہلے باب میں بلوچستان کی ابتدائی افسانہ نگاری کے سلسلے میں بھی ان کا تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ انہوں نے ۱۹۴۷ء میں جو بھی افسانے لکھے ہیں ان میں سے بعض افسانوں میں فسادات کا عکس نظر آتا ہے انور رومان کا اس سلسلے میں تحریر کیا ہوا افسانہ "غیرفانی" ہے جو ایک ادبی مجموعہ "مشعل" مرتبہ عبدالرحمان غور ۱۹۴۸ء ادارہ

۱۔ ڈاکٹر فردوس انور قاضی۔ غیر مطبوعہ

ادب مبی" میں تحریر ہے۔ اس افسانے کی کہانی کچھ یوں ہے ایک ریلیف کیمپ میں مسلمان بھوک اور پیاس سے تڑپ رہے تھے وہ دشمنوں کے خوف وہراس اور بھوک وپیاس کی وجہ سے موت کے غار میں لڑھکتے جارہے تھے۔ اس وقت ایک آدمی کیمپ میں ان کی مدد کرتا ہے اور وہ دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان دے دیتا ہے۔

انور رومان کے اس افسانے میں ہمدردی۔ ایثار و قربانی کا جذبہ انسانیت' نیکی' مجبوری اور بے بسی کی کیفیت کا اظہار ملتا ہے ۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد قتل وغارت' عداوت ودشمنی اور درندگی کے جو مظاہرے ہوئے ہیں اس کی گونج سنائی دیتی ہے۔

اسی طرح ان کا ایک اور افسانہ "ویری ناگ" ہے جو ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء میں ہفتہ وار "زمانہ" کوئٹہ میں تحریر ہوا ہے۔ یہ افسانہ بھی فسادات کے موضوع پر لکھا گیا ہے اس میں ایک کشمیری مجاہد کی ذہنی کیفیات اور نفسیاتی اثرات کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک کشمیری مجاہد جو ۱۹۴۷ء کے جنگ کے اثرات سے متاثر ہے وہ بھارت کے ظلم وستم اور کشمیریوں پر ڈھائے گئے ظلم اور تشدد کا جائزہ لے رہا ہے۔ وہ کشمیریوں کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے وہ بھارتی حملہ آوروں کو گولیوں کا نشانہ بنا کر آگے جانا چاہتا ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد بھی اس کی رگوں میں آزادی کا خون دوڑ رہا ہے اس کے دل میں کشمیر کو آزاد کرانے کی تڑپ موجزن ہے۔

کشمیر کی آزادی کی تمنا ہے
اس افسانے میں کہانی کا موضوع مقبوضہ کشمیر ہے۔ جس میں آزادی کے بعد
لیکن اس افسانے میں کہانی اور موضوع سے زیادہ تشبیہ واستعاروں کا حسن زیادہ نظر آتا ہے اس افسانے میں خارجی حسن منظر نگاری اور محاکاتی تصاویر پر توجہ دی گئی ہے۔ جس کے سبب کہانی میں معنوی تاثیر اور حسن ذرا کم ہی نظر آتا ہے انور رومان کے افسانوں میں محاسن کا ادراک کم ہے ان کا طرز تحریر زندگی کے مسائل کی عکاسی کرتے وقت حقائق کے ان احساسات کو کم چھوتا ہے جو مسائل کی سنگینی کا احساس دلا سکے۔ فنی اعتبار سے انہوں نے افسانے کے تمام لوازم کو برتنے کی کوشش کی ہے۔

انہیں کے ساتھ ایک اور نام خادم مرزا کا ہے۔ بلوچستان میں اردو افسانہ نگاری کے حوالے سے یہ ایک بڑا نام ہے۔ لیکن ہم فسادات کے زیر اثر ان کے چند افسانوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کا تفصیلی جائزہ بعد میں لیا جائے گا۔

ان کے افسانوی مجموعے "سات رنگ اور ایک گیان" میں ایک افسانہ "سات رنگ اور ایک گیان" ہے

جو فسادات کے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ یہ افسانہ تقسیم کے المیہ سے پید
کے دکھ سے گزرنے والے اس خاندان کی کہانی ہے جو خود بھی تقسیم ہو گیا۔ ا ر
پاکستان کی تقسیم۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے حوالے سے ہجرت در ہجرت کے واقعات

کہانی یوں ہے کہ پاکستان بننے کے بعد حامد کا آدھا خاندان ہجرت کرکے پاکستان ...تا ہے اور آدھا ہندوستان ہی رہتا ہے۔ حامد کی خالہ پاکستان چلی جاتی ہے جبکہ وہ خود اور اس کی والدہ ہندوستان ہی میں رہتی ہیں۔ خالہ کی بیماری کا تار ملتے ہی وہ پاکستان چلا جاتا ہے خالہ پہلے لاہور رہتی ہیں پھر کراچی چلی جاتی ہیں۔ حامد بڑا ہو کر مشرقی بنگال چلا جاتا ہے۔ اور وہیں ملازمت اختیار کر کے شادی کر لیتا ہے۔ وہ جب دوسری مرتبہ خالہ کے پاس کراچی جاتا ہے تو پاکستان کے حالات اور ان کی تہذیب میں تبدیلی دیکھتا ہے۔ شراب ورقص کے دور چلتے دیکھ کر وہ سوچتا ہے لوگ ہجرت کر کے اپنی تہذیب وتمدن سے بدل گئے ہیں وہ بنگال چلا جاتا ہے۔ لیکن مشرقی بنگال میں بھی فسادات شروع تھے۔ گھر میں جا کر نوکر سے ملتا ہے۔ وہ بنگال کے حالات سے خوفزدہ ہے حامد بھی حالات کی وجہ سے پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ سکون کی خاطر بنگال کا لباس پہن کر ہندوستان کی طرف نکل جاتا ہے۔ راستہ میں بارش ہونے کی وجہ سے اس کا پاؤں پھسل جاتا ہے۔ اور وہ گر جاتا ہے تو کٹے ہوئے درخت کا ایک حصہ اس کے سینے میں لگتا ہے۔ وہ رینگ کر آگے کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔

(۱) "اور چیخ رہا تھا...... میں "گیا" کے اس "بڑ" کی طرف جا رہا ہوں۔ جہاں گوتم ....
کو نروان ہوا تھا۔"

وہ فسادات اور جنگ کے حالات دیکھ کر اس قدر پریشان ہے کہ اسے مہاتما بدھ یاد آجاتے ہیں۔ مہاتما بدھ کو بڑ کے درخت کے پاس گیان ہوا تھا۔ انہیں سکون ملا تھا۔ اس لئے حامد بھی سکون کی تلاش میں "بڑ" کے درخت اور مہاتما بدھ کو یاد کرتا ہے۔ جس طرح مہاتما بدھ اپنے گھر بیوی بچے کو چھوڑ کر جنگل میں "بڑ" کے درخت کے پاس بیٹھے رہتے تھے۔ اسی طرح حامد بھی فسادات اور جنگ کے واقعات سے گھبرا کر سکون کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہے۔

آخری فقرے دیکھئے۔

(۲) "مجھے گیان کی روشنی تک پہنچنے دو...... میں بیوی اور بچے کا منہ دیکھے بغیر اپنے ہی گھر سے بھاگ رہا ہوں..... مجھے جنگ سے نفرت ہے۔"

۱-۲ "سات رنگ اور ایک گیان" خادم مرزا ص ۱۳۶

اس افسانے میں جنگ کے اثرات اس سے پیدا ہونے والے مسائل حادثات کے پس منظر میں فلسفیانہ انداز میں جنگ سے نفرت کا اظہار ہے۔ اسی طرح خادم مرزا کا ایک اور افسانہ "ڈرے ہوئے لوگ" بھی فسادات سے متعلق ہے۔ اس افسانے میں کراچی کے فسادات کی وجہ سے لوگ ڈرے ہوئے اور سہمے ہوئے ہیں۔ گولیاں اور کلاشنکوف چل رہے ہیں۔ ایک عجیب افراتفری کا عالم ہے۔

اس افسانے میں ڈر کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے دروازے کھٹکھٹاتے ہیں لوگوں کو ہر وقت پریشانی کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ جبکہ آدھی رات کے وقت دروازے کھٹکھٹانا تہذیب کے خلاف ہے لیکن جب ملک بدامنی کا شکار ہو تو عوام کس طرح بے یقینی، خوف اور کرب سے گزرتے ہیں افسانہ "ڈرے ہوئے لوگ" میں اس خوف کی ایک موثر عکاسی ملتی ہے۔

یہاں ہم نے انور رومان اور خادم مرزا کے بعض افسانوں میں فسادات کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ انور رومان نے فسادات کے پس منظر میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ زیادہ موثر غالباً اس لئے نہیں ہے کہ وہ ہجرت کے دکھ اور تجربے سے براہ راست نہیں گزرے۔ بلوچستان کی ابتدائی افسانہ نگاری میں جو افسانے پیش کئے گئے ہیں ان میں سے بیشتر افسانوں میں لکھنے والے کا نام بھی درج نہیں ہے۔ انور رومان کے ان ابتدائی افسانوں میں بعض کمزوریاں ہیں مثلاً۔ کہانی میں ربط و تسلسل کی کمی افسانے کو غیر دلچسپ بناتی ہے ان واقعات میں منطقی جواز کی طرف توجہ کم کی ہے جس کے سبب بعض اوقات کہانی غیر فطری معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں وہ دلکشی کم ہے جو حقائق اور معاشرتی صداقتوں کے مشاہدے، مطالعے سے پیدا ہو سکتی ہے۔

لیکن فسادات کے پس منظر سے ہٹ کر انہوں نے جو افسانے ماحول کے مطالعے اور مشاہدے کی بنیاد پر لکھے وہ تاثر کے اعتبار سے نسبتاً بہتر ہیں۔ ان کے مقابلے میں خادم مرزا کے افسانے تیکنیک اور فن کے لحاظ سے کامیاب افسانے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے تاثرات، تجربات اور مشاہدات کے لحاظ سے اپنے اندر کشش رکھتے ہیں۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک کا افسانہ اور بلوچستان کے افسانہ نگار

سید خلیل احمد

سید خلیل احمد ایک مشہور افسانہ نگار ہیں وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہیں بلکہ انہوں نے ترقی پسندوں میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس ترقی میں خلیل احمد کا بھی حصہ ہے افسانوں میں سب سے پہلی چیز جو زیادہ

متاثر کرتی ہے۔ وہ افسانے کا عنوان ہوتا ہے سید خلیل احمد کے افسانوں کے نام زیادہ تر رومانی ہیں۔ ان عنوانوں میں شعریت اور غنائیت بہت نمایاں حیثیت رکھتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے انہوں نے شعروں سے متاثر ہو کر افسانہ لکھا ہے "خزاں بدوش بہار" "خمار زہر آلود" "شمع بجھتی ہے تو" "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے" "درد وہ سنگ گراں ہے" اور "اک تیرے جانے کے بعد"۔ یہ سب ایسے عنوانات ہیں جن میں ایک شعری حسن پایا جاتا ہے۔ ان کے تمام افسانوں میں معنویت پائی جاتی ہے۔

اسی طرح موضوع بھی افسانہ نگار کے لئے ایک کڑی آزمائش کا مرحلہ ہوتا ہے۔ زندگی کے سینکڑوں پہلو ہوتے ہیں جو حسین بھی ہوتے ہیں اور خوفناک بھی ہوتے ہیں۔ افسانہ نگار ان میں سے کسی ایک پہلو کو پیش کرتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے سید خلیل احمد کے افسانوں میں کوئی تنوع نہیں ہے۔

سید خلیل احمد کے مجموعے "خمار زہر آلود" میں تین افسانے شامل ہیں۔ (۱) "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے"۔ (۲) "خزاں بدوش بہار"۔ (۳) "درد وہ سنگ گراں ہے"۔

۱۔ "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے" میں انہوں نے آج کل کے معاشرے کی بالکل صحیح اور حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ دراصل اس میں انہوں نے معاشرے کا ذہنی انتشار، مروت و محبت کا نیلام ہونا۔ اقدار کا بدلنا اور اس کے کرب کو محسوس کیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک شخص اور اس کا ہمزاد ہے وہ آزادی کی رات پوری رات گھومتے رہتے ہیں۔ اس میں انہوں نے زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے یوم آزادی والے دن جھنڈیوں کا ہوا میں لہرانا۔ سیاست کی دھواں دھار تقریریں۔ نعرہ بازی عورتوں مردوں کا مجمع۔ فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے لوگ۔ مزدور۔ بھکارن، بھنگن، اخبار نویس، بیکار لوگ، رنگ برنگی عورتوں کا ہجوم، غنڈوں کی عورتوں سے سر بازار چھیڑ چھاڑ، تیل مالش بوٹ پالش، ۔

غرضیکہ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا جزیاتی مشاہدہ پیش کیا ہے۔ جزئیات نگاری، ان کی تحریر کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ اور بعض چھوٹی چیزیں جو بظاہر غیر اہم معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں اہم نظر آنے لگتی ہیں۔ جزئیات نگاری اور غیر اہم کو اہم بنا کر پیش کرنا چھوٹی اور بظاہر معمولی چیزوں کو علامتی انداز عطا کرتا ہے۔ جس سے ان کے افسانوں میں معنوی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر فردوس انور قاضی تحریر کرتی ہیں۔

(۱) "اردو افسانے میں انگریزی اثر سے بہت سی تحریکیں متعارف ہوئیں مغربی تحریکات اور ہیئت کے تجربات نے شعور کی رو Stream of Consciousness کو اردو

افسانے میں متعارف کرایا۔ سب سے پہلے یہ تجربہ انگارے کے افسانے میں نظر آتا ہے۔ جس کو سجاد ظہیر نے برتا۔ ان کا افسانہ نیند نہیں آتی Stream of Consciousness کے طریقہ کار پر لکھا گیا۔ اردو ناول نگاری میں قرۃ العین حیدر نے اس ٹیکنیک کو استعمال کیا۔ مغرب میں اس کے پیشرو جیمس جوائس اور ورجینا وولف تھے سید خلیل احمد کے افسانوں میں شعور کی رو کی ٹیکنیک استعمال کی گئی ہے۔ ان کا افسانہ "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے" افسانہ "نیند نہیں آتی" کی ترقی یافتہ شکل ہے افسانہ نیند نہیں آتی میں نہ صرف شعور کی رو کا تجربہ کیا گیا تھا بلکہ یہ اپنے عہد میں لگے بندھے ان اصولوں کو توڑنے کی کوشش بھی تھی۔ جس کے تحت جنس کے موضوع کو شجر ممنوعہ سمجھ لیا گیا تھا۔ اور جن کے تحت عورت کے متعلق نہیں بلکہ بقول منٹو کے "نیک بیبیوں کی باتیں ہی کی جاسکتی تھیں۔ جس میں عورت کو ایک مثالی روبوٹ کے روپ میں دیکھنے کی خواہش شامل تھی۔ عورت کے نہ جذبات تھے۔ نہ احساسات۔ وہ بس ایک کٹھ پتلی تھی۔ جو پورے گھر شوہر، اور بچوں کے لئے ایثار و قربانی اور خدمت کے علاوہ کچھ سوچنے کا حق نہیں رکھتی تھی۔ اس لئے سجاد ظہیر کی اس ابتدائی کوشش میں تجربات کے کچے پن کے علاوہ دانستہ طور پر بھی غیر معتدل لب و لہجہ اختیار کیا گیا تھا۔"

(۲) "سید خلیل احمد کے افسانے "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے" کی ٹیکنیک بھی تقریباً وہی ہے جس میں خود کلامی کی کیفیت ہے اس افسانے کا تانا بانا خود کلامی سے ہی بنایا گیا ہے۔ جس میں خیالات کی یلغار ہے مطالعے، مشاہدے، زندگی کی تلخیاں، تنہائی، معاشی تنگدستی سے پیدا ہونے والی بوسیدگی، منطق زندگی سے متعلق فلسفہ، خیالات کی رو میں ایک ایک چیز ابھرتی ہے۔ اس افسانے میں میر، غالب، فانی، میراجی، اور فیض کے افکار و خیالات کے علاوہ بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے خیالات، خارجی ماحول کی بے ہنگم آوازوں، ہوٹلوں میں بجنے والے گراموفون، پرانے گانے، زندگی کے ستائے ہوئے کرداروں کے منہ سے نکلنے والی بے ساختہ گالیاں سب چیزیں افسانے میں گڈ مڈ ہو کر سامنے آتی ہیں۔ جس کے سبب زندگی کی وہ گہماگہمی اور لایعنیت ابھر کر سامنے آنے لگتی ہے۔ جسے شیکسپئر نے اپنے

۱-۲ ڈاکٹر فردوس انور قاضی، غیر مطبوعہ

ڈرامے "میکبتھ" میں ایک کردار کی وساطت سے پیش کیا ہے۔ مثلاً "Life is a tale, told hy an idiot, full of sound and fury signifying, nothing. زندگی ایک کہانی ہے ایک بیوقوف کی زبانی جو آوازوں اور جذبات سے بھرپور ہے۔ لیکن جس کے کوئی معنی نہیں۔ یا فانی کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا"

افسانے "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے" میں دیکھئے

(۱) "ہاں۔ لوگ خوشی منارہے ہیں یا ....؟" اس کے لبوں پر پراسرار مسکراہٹ ہے۔ کافی ہاؤس کے نیچے طلاب علموں، ادیبوں، اخبار نویسوں اور بیکاروں کا ہجوم... انگنت نگاہیں جگمگاتے ہوئے قمقموں کے اندھیرے میں کچھ ڈھونڈھ رہی ہیں... کیا؟ کوئی منزل، کوئی مرکز... اس جنون خیز تگ و دو، اس طوفان و تلاطم کا کوئی مطلب... منزل نہیں ہے دور دور تک.... امیدوں کے بھوت ناچ رہے ہیں.... زندگی چھلاؤوں کا مسلسل رقص ہے.... سمجھنے کا نہ سمجھانے کا.... خواب ہے دیوانے کا.... ڈیزل انجنوں کی گھر گھر.... گھنٹیوں کی ٹن ٹن.... موٹروں کی پوں پوں.... دل بہار لسی ...."

اس افسانے کو پڑھنے کے بعد خیالات کا ایک جنگل سمٹا ہوا نظر آتا ہے جس میں زندگی کا مطالعہ، مشاہدہ اپنے خیالات ناآسودگی، تنہائی، پیاسے جسم، جنسی بھوک، زندگی کو سوچتے ہوئے سینکڑوں سوالات، مختلف مفکروں اور شاعروں کے افکار و نظریات اور خارجی زندگی کا بے ہنگم شور گڈ مڈ ہو کر افسانے میں در آیا ہے۔ اس افسانے میں خیالات افکار و نظریات اور زندگی سے متعلق سوالات ہی کردار کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ان تمام چیزوں اور خیالات کے تصادم سے افسانہ آگے بڑھتا ہے۔ افسانے "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے" میں شعور کی رو کی طرح ایک خیال سے دوسرا خیال پیدا نہیں ہوتا بلکہ حال کی زندگی۔ خارجی مظاہر، بے ہنگم شور، آوازیں، ہوٹلوں سے ابھرنے والے گانوں کے بول، داخلی دنیا، تصورات افکار و نظریات سے متصادم نظر آتے ہیں۔ اس تصادم میں بظاہر کوئی ربط نہیں۔ لیکن افسانے کا مرکزی کردار "میں" مشاہدہ اور خیالات میں ایک خوبصورت ربط پیدا کر دیتا ہے۔

۱- "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے" "خمار زہر آلود" خلیل احمد، ص ۴۹-۵۰

"جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے" کا یہ حصہ ملاحظہ کیجئے

(۱) "ایک وہ زمانہ تھا کہ لوگ دیسی گندم کھاتے تھے۔ اور ولایتی شراب پیتے تھے" وہ کہتا ہے... "ایک یہ زمانہ ہے کہ ولایتی گندم کھاتے ہیں اور دیسی شراب"..... "خدا کے نام پر بابا اندھا محتاج ہوں... بس اسٹاپ ویران ہو رہا ہے.... تالے لمبی کے تالے کالی.... لاؤڈ سپیکر بدستور چلا رہا ہے.... سڑک پر قدرے خاموشی ہے.... بھوکا ہوں کوئی روٹی.... او باہر والے دو کڑک چائے لاؤ.... تیسری منزل کے ایک فلیٹ کی بالکنی سے کوئی چلاتا ہے.... او ہائے چناں رات جدائیاں والی.... اس طویل رات کی سحر کب ہوگی؟.... جب دنیا سو جاتی ہے اور رات کے تیرہ و تار قلب میں تنہائی کا درد جاگ اٹھتا ہے' تو تم اپنے سفید ٹھنڈے دوشیزگی کی طرح بے داغ اور ٹھنڈے' بستر پر کروٹیں بدلتے اور اپنی تنہائی کی تیرگی میں گھورتے ہوئے سوچتی ہوگی کہ یہ رات کب ختم....."

"جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے" کے بارے میں ڈاکٹر فردوس انور قاضی لکھتی ہیں۔

(۲) "سید خلیل احمد کے اس افسانے میں خارجی اور داخلی خیالات کا تصادم پورے افسانے میں اسی طرح محیط ہے۔ لیکن افسانے میں فنی تیکنیک کا کمال یہ ہے۔ یہ تمام بے ربطی جس میں داخلی سوچ' اور باہر کی بے ہنگم آوازیں' اشعار کے ٹوٹے ہوئے مصرعے اور گانوں کے ادھورے بول ہوں۔ یا زندگی کے بارے میں کوئی گہری بات۔ فلسفہ یا فکر ہو۔ جنسی ناآسودگی کی جھلاہٹ ہو۔ تنہائی ہو یا مفلسی سے پیدا ہونے والا کرب یہ تمام چیزیں بے ربطی کے باوجود افسانے میں ایک تسلسل اور دریا کی روانی جیسی کیفیت رکھتی ہیں۔ جس کے سبب افسانے کے اندرونی ڈھانچے میں ایک منظم ربط پیدا ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں پلاٹ یا کوئی بنی بنائی کہانی نہیں ہے۔ خیالات کا ایک تسلسل ہے جو اندر اور باہر کی آوازوں سے مل کر بنا ہے یہ تسلسل ہی زندگی کے مختلف رخ اور چہرے سامنے لاتا ہے۔ اور ختم ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں بظاہر کوئی کردار نہیں اور سینکڑوں کردار ہیں۔ جو حال کے مشاہدے اور ماضی کے مشاہدے کی مدد سے افسانہ نگار کے ذہن میں ابھرتے چلے آتے ہیں۔"

۱۔ "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے" "غبار زہر آلود" سید خلیل احمد' ص ۶۷-۶۸
۲۔ "ڈاکٹر فردوس انور قاضی' غیر مطبوعہ

یہ کردار سیاست کی بازی گری۔ تقریریں' نعرے بازی' سیاست دانوں کی شعبدہ بازی' بندر کا تماشا ڈگڈگی۔ کٹھ پتلی کا ناچ سے لے کر زندگی کے وسیع مطالعہ اور مشاہدہ کے ساتھ اشعار اور افکار پر محیط ہیں۔ یہ ایک طویل افسانہ ہے۔ اس میں چیخوف کے افسانوں کی طرح کوئی پلاٹ نہیں نہ کوئی کہانی ہے۔ مگر چیخوف کے یہاں بغیر پلاٹ اور بغیر کہانی کے بھی زندگی کے کسی ایک رخ کی مکمل تصویر کہانی کی شکل میں ملتی ہے۔ چیخوف کے افسانوں کا کوئی حصہ درمیان سے نکالا نہیں جاسکتا۔ ان کا ہر فقرہ اور ہر حصہ افسانے میں لازمی جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ افسانے "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے" ذرا مختلف نوعیت کا افسانہ ہے۔ اس کی طوالت ذرا گراں بھی گزرتی ہے۔ کیونکہ اس افسانے کی تمام خوبیوں کے باوجود ایک خامی یہی ہے کہ اگر درمیان سے اس کا صفحہ دو صفحہ' پیراگراف' یا جملے چھوڑ کر بھی پڑھا جائے تو افسانے پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ افسانے کی کمزوری ہے۔ لیکن جس عہد میں یہ افسانہ لکھا گیا اس وقت یہ تیکنیک افسانے میں ایک نیا اور پسندیدہ تجربہ تھا جس میں ہیئت کے نئے تجربات کے ساتھ مغرب سے آئے ہوئے نظریات افکار اور علم و آگہی کا دکھ شامل ہے۔

"درد وہ سنگ گراں ہے"۔ اس افسانے میں سید خلیل احمد نے خالہ کو جنسی مریض دکھایا ہے۔ ان کے ممتاز اور سہیل دو بچے ہیں۔ بیوہ ہونے کے بعد وہ جنسی کمزوری کا شکار ہو جاتی ہیں اور وہ نئے نئے لڑکوں کو پھنساتی ہیں۔ پہلے وہ حسنین کو قابو کرتی ہیں۔ لیکن وہ ان کی بیٹی ممتاز سے محبت کرتا ہے۔ ممتاز بھی اس پر فریفتہ ہے۔ اور دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن خالہ درمیان میں حائل رہتی ہیں۔ اور جب وہ اپنے جنسی جذبے میں ناکام رہتی ہیں تو ممتاز اور ان کے درمیان رقابت پیدا ہو جاتی ہے۔ حسنین ممتاز سے محبت کرنے سے پہلے شراب پینے کا بہت شوقین ہوتا ہے۔ لیکن وہ نفسیاتی الجھنوں کا شکار رہتا ہے۔ بلکہ وہ الجھنوں کو خود خریدتا ہے۔ اسی اثناء میں خالہ کا رشتے میں بھانجا جمیل پشاور سے کراچی خالہ کے پاس کسٹم آفیسر کے انٹرویو کے سلسلے میں آکر ٹھہرتا ہے۔ وہ ایک بدمعاش اور آوارہ انسان ہے۔ کسٹم میں نوکری ملنے کے بعد وہ رشوت کی چیزیں خالہ کو تحفے میں دیتا ہے۔ تاکہ وہ اس سے خوش ہو جائیں۔ خالہ اس سے جنسی تعلقات قائم کرلیتی ہیں۔ سہیل اور ممتاز دونوں بچے اپنی والدہ کی اس نازیبا حرکات کی وجہ سے سخت پریشان رہتے ہیں۔ ممتاز حسنین سے کہتی ہے۔

(۱) "نہ جانے امی کو کیا ہوگیا ہے.... مجھے ان سے نفرت سی ہونے لگی ہے.... گھن آتی ہے۔ مجھے جب ان کا خیال آتا ہے تو شرم سے کٹ مرتی ہوں.... مجھے اب گھر کی ہر چیز سے' کھانے

پینے سے گھن محسوس ہوتی ہے.... جیسے ہر چیز نجس اور ناپاک ہو بلکہ.... بلکہ بعض.... بعض
اوقات یوں لگتا ہے جیسے میں آنکھوں دیکھے مکھی نگل رہی ہوں۔ اور کھانے کے بعد ابکائی
آنے لگتی ہے۔"

ممتاز اپنی والدہ کی طرف سے سخت پریشان رہتی ہے اور یہ دکھ اسے اکثر اوقات اکیلے پن کا احساس
دلاتا ہے۔ حسنین ممتاز سے محبت کرتا ہے۔ اسے تسلی دیتا ہے۔ اور جلد شادی کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے۔
شادی کرنے سے پہلے وہ مال لینے کے سلسلے میں ایک ہفتہ کے لئے جہلم جانا چاہتا ہے۔ اور وہ خالہ کے
گھر جاکر شادی کی تاریخ کا اعلان کردیتا ہے۔ اور ساتھ ہی سفر پر جانے کی خبر سناتا ہے۔ خالہ کسی خوشی کا اظہار
کرنے کے بجائے خاموش رہتی ہیں۔

جمیل خالہ سے جنسی تعلقات قائم کرنے کے بعد ان کو اپنے زیر اثر کرکے ممتاز سے شادی کرنے پر رضامند
کرلیتا ہے۔ ایک ہفتہ بعد جب حسنین واپس آتا ہے۔ تو جمیل کے ساتھ ممتاز کی شادی کی خبر سن کر بہت پریشان
ہوتا ہے۔ کافی عرصہ تک سخت بیمار رہتا ہے اسے اس شادی کا یقین نہیں آتا۔ جمیل ممتاز سے شادی کرنے کے
بعد خالہ کو چھوڑ دیتا ہے اور ممتاز کو لے کر پشاور چلا جاتا ہے۔

حسنین ایک عرصہ بعد صحت یاب ہوکر جب خالہ کے پاس آتا ہے۔ تو خالہ حسنین پر دوبارہ ڈورے ڈالتی
ہیں۔ تو حسنین ان سے سخت نفرت کا اظہار کرتا ہے۔

(۲) "خالہ جان! وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔ غصے
سے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اور اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے....
"خالہ جان!.... آج.... مجھے 'میری سمجھ میں آگیا۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ آج.... مجھے
آج.... میں نے آج اس پہیلی.... اس پہیلی کو بوجھ لیا ہے.... جو دو سال سے مجھے
دو سال سے میرے لئے.... اذیت.... سوہان روح بنی ہوئی تھی.... آج میں سب کچھ سمجھ
گیا ہوں.... خالہ جان! آپ نے اپنی ہوس کی تسکین کے لئے تین زندگیوں کو تباہ کیا...."

خالہ حسنین کے اس رویے پر سخت نادم ہوئیں۔ وہ خواب آور گولیاں کھاکر خودکشی کرلیتی ہیں۔
جو ماں سے بہت محبت کرتا ہے۔ ان کے مرنے کے بعد زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ وہ بھی باقی ماندہ خواب آور گولیاں
کھاکر خودکشی کرلیتا ہے۔ سہیل کی موت دراصل اس بچے کی موت ہے۔ جو ماں کے پیار کو ترس گیا تھا۔

۱۔ "درد وہ سنگ گراں ہے" "خار زہر آلود" سید خلیل احمد 'قلات پبلشرز مستونگ 'ص نمبر ۳۸
۲۔ "درد وہ سنگ گراں ہے" سید خلیل احمد 'ص نمبر ۴۴-۴۸

لاپرواہی اس کی موت کی وجہ بنتی ہے۔

سید خلیل احمد نے اس افسانے میں معاشی مسائل اور جنسی گھٹن کی بہت اچھی عکاسی کی ہے۔ معاشرے کی
اس بے راہ روی کا اظہار کیا ہے۔ جس میں اکثر گھرانے رشتوں کا احترام نہیں کرتے اور عدم اعتماد کی وجہ سے
کرب و اذیت میں مبتلا رہتے ہیں۔

"خزاں بدوش بہار"۔ اس افسانے کا موضوع بھی اسی طرح کا ہے۔ اس میں شوکت مصور ہے دو بہنیں
نزہت اور طلعت ہیں۔ تینوں کردار ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ انہیں ایک دوسرے سے الگ
نہیں کیا جاسکتا۔

اس افسانے میں بڑی بہن نزہت بہت شوخ، چنچل اور بے باک وزندگی سے بھرپور ہے وہ شوکت سے
محبت کرتی ہے۔ اور اسے زندگی کا احساس دلاتی ہے۔ جبکہ دوسری طلعت ہے۔ بہت خاموش، اداس خزاں کے
پتوں کی طرح زرد ہے۔ وہ مادی لذتوں سے بالاتر ہوکر خاموش محبت کرتی ہے۔ شوکت مصور ہے وہ دق کا
مریض ہے اور فنکار ہے۔ طلعت بھی دق کے مرض میں مبتلا ہے۔ دونوں کے مرض ایک جیسے ہیں۔ اور دونوں
میں ایک بے نام سا تعلق ہے جبکہ نزہت کا کردار ایک بڑا کردار ہے۔ وہ سب پر چھائی ہوئی ہے۔ لیکن شوکت
اپنے رویے اور نظریات کی وجہ سے سب کو متاثر کرتا ہے شوکت کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی پیدا ہونے
کے بعد نہیں بلکہ مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ لیکن نزہت کا پیار شوکت کی زندگی میں اشتعال پیدا کردیتا ہے۔
نزہت جو اس کے لئے زندگی ہے وہ اس کے فن کی رقیب اور موت بن گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر نزہت نہ ملی
ہوتی تو شاید وہ کچھ دن اور جی سکتا تھا۔

طلعت جو مادی لذتوں سے بالاتر ہوکر شوکت کو چاہتی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ جب
شوکت کی زندگی ختم ہونے اور موت غالب آنے لگتی ہے تو طلعت اس کے فن میں اشتعال پیدا کرتی ہے۔ یہی
وجہ ہے کہ شوکت اگر طلعت سے نہ ملا ہوتا تو وہ ایک بڑا فنکار نہیں ہوتا۔ طلعت شوکت کو تصویروں کے بارے
میں مشورہ دیتی ہے۔

(۱) "اس میں کوئی رات کا منظر پیش کیجئے پہلی میں آپ نے بہار کا منظر دکھایا ہے۔ دوسری
میں غروب آفتاب اور تیسری میں چاندنی رات۔ اب اندھیری رات کی باری ہے۔"
تصویر کے موضوع کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار کرتی ہے۔

۱۔ "خزاں بدوش بہار" "خار زہر آلود" سید خلیل احمد 'قلات پبلشرز مستونگ '۱۹۴۸ء ص نمبر ۱۷۶

(۱) "ایک بیوہ کی تصویر بنایئے ماتمی لباس میں ...... وہ خلا میں دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔"

شوکت صاحب کے ساتھ طلعت کی گفتگو دیکھئے۔

(۲) "شوکت صاحب: آپ کو اس بند کمرے میں ڈر نہیں لگتا؟

طلعت نے بند کھڑکی کے شیشے سے باہر جھانکتے ہوئے پوچھا

......"کیوں؟" "شوکت نے منہ موڑ کر پوچھا

"....وہ دیکھئے نیچے قبرستان ہے......"

"تو پھر؟" شوکت نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔"

"وہاں لیٹے ہوئے مردے دن رات آپ کی کھڑکی کی طرف دیکھتے رہتے ہوں گے۔"

اس افسانے میں طلعت کا کردار ایک چھوٹا کردار ہے۔ لیکن کہانی کے اختتام پر وہ ایک مرکزی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ اس افسانے میں سید خلیل احمد نے کردار نگاری بہت اچھی کی ہے۔ اور افسانہ بڑی بے ساختگی اور موثر انداز میں بیان کیاگیا ہے۔

"مالک"۔ یہ افسانہ رسالہ سہ ماہی "قلم قبیلہ" کوئٹہ جولائی تا دسمبر ۱۹۹۴ء میں تحریر کیاگیا ہے۔ سید خلیل احمد کا ایک خوبصورت افسانہ ہے۔ ایک سات منزلہ عمارت میں مختلف قسم کے اور طبقے کے لوگ رہتے ہیں۔ مسلمان، عیسائی، پارسی، رکشہ ڈرائیور، کاروں کے مالک، دفتری ملازم سب ہی اس عمارت میں رہتے ہیں۔ اس عمارت کی نیچے والی منزل بہت تاریک اور گندی ہے۔

اس عمارت میں تین کارندے ہیں جو زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان تین آدمیوں میں سے پہلا آدمی منشی ہے جو ہر ماہ کی تین تاریخ کو سب سے کرایہ وصول کرتا ہے۔ اس لئے ہر وقت اس کے ہاتھ میں قلم اور سید بک رہتی ہے۔ دوسرے نمبر پر جمعدار ہے۔ جس کی شکل و صورت سے لوگ مرعوب ہیں لیکن اس کی زبان کی مٹھاس، شائستگی اور ہمدردی نے اسے لوگوں میں ہردلعزیز بنادیا ہے۔ وہ عمارت کی حفاظت و نگرانی کے علاوہ صفائی و دقاع کے فرائض بھی سرانجام دیتا ہے۔ تیسرے آدمی ننھے میاں ہیں اس کے اصل نام سے لوگ نہ واقف ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ مالک کے دور دراز عزیزوں میں سے ہے۔ وہ لمبا چغہ پہنے ہاتھ میں تسبیح لئے گھوما کرتا ہے۔ اور لوگوں کے گھروں میں آزادی سے آتا جاتا ہے۔ عورتیں اسے نیک

۱۔ "خزاں بدوش بہار" "خمارِ زہر آلود" سید خلیل احمد 'قلات پبلشرز مستونگ' ۱۹۴۸ء 'ص نمبر ۱۷۷
۲۔ "خزاں بدوش بہار" "خمارِ زہر آلود" سید خلیل احمد 'قلات پبلشرز مستونگ' ۱۹۴۸ء 'ص نمبر ۱۸۸

اور پیر سمجھ کر اپنے گھریلو مسائل میں مشورہ لیا کرتی ہیں۔

اس افسانے میں ایک خاص کردار بیوہ عورت کا دکھایا ہے۔ وہ سب سے نچلی منزل کے ایک فلیٹ میں رہتی ہے۔ اس کے تین بچے ہیں۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ بڑا لڑکا جوئے اور شراب نوشی کی بری عادتوں میں پڑ کر کئی کئی دن گھر سے غائب رہتا ہے۔ لڑکی سولہ سترہ سال کی جوان ہے۔ لڑکا چھوٹا ہے۔ گھر میں کوئی آمدنی کا وسیلہ نہ ہونے کی وجہ سے فاقوں کی نوبت آجاتی ہے۔ منشی اور جمعدار اسے کرایے کی ادائیگی کے لئے ہر وقت تنگ کرتے ہیں۔ وہ اپنی پریشانی دور کرنے اور خود نوکری کرنے کی غرض سے ان دیکھے مالک کو دیکھنے اور ملنے کے تجسس میں ساتویں منزل پر جاتی ہے۔ لیکن پھر وہاں سے زندہ نہیں آتی ہے۔ اس کی موت مالک یعنی منشی کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ جو ساتویں منزل پر رہتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی خدا کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ سات منزلہ عمارت سات آسمانوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ان دیکھا مالک خدا ہی کو کہہ سکتے ہیں۔

یہ افسانہ ایک عمدہ اور دلکش علامتی افسانہ ہے۔ سید خلیل احمد نے اس میں معاشی تنگدستی اور پیچیدہ معاشرتی مسائل کی عکاسی کی ہے۔[1]

"بھابی"۔ ادب لطیف سالنامہ لاہور ۱۹۵۹ء ص نمبر ۹۰ میں تحریر ہوا۔ یہ دیور بھابی کی کہانی ہے۔ اس میں بھابی پانچ سالہ دیور کو اپنی اولاد کی طرح پالتی ہے۔ بھابی کا میاں عمر میں اس سے بڑا ہے۔ اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوتی جس کی وجہ سے اس کی پوری توجہ دیور ہی پر رہتی ہے۔ اس کا دیور بھی بھابی کو ماں سمجھتا ہے۔ پورے افسانے میں بھابی ایک قابل احترام ہستی نظر آتی ہے۔ وہ اپنے خاوند کی خدمت کرتی ہے۔ لیکن جب اس کا دیور بیرون ملک جاتا ہے۔ اور وہ کمرے میں اپنی بھابی سے ملنے آتا ہے۔ اس وقت بھابی روتے ہوئے اپنے دیور کی پیشانی پر بوسہ دینے کے بجائے دیور کے ہونٹ چوم لیتی ہے۔ اور اسے سینے سے لگا کر بھینچتی ہے۔ یہ حرکت دیور کو حیران کردیتی ہے اور اس طرح بھابی کی عظمت بھی خاک میں مل جاتی ہے۔

اس افسانے میں سید خلیل احمد نے شوہروں کی لاپرواہی، بے جوڑ شادی اور معاشرتی و جنسی پیچیدگی کی عکاسی کی ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار زیادہ تر داخلیت پسند ہیں جو ان کے حساس ہونے کو ظاہر کرتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی سید خلیل احمد کے افسانوں میں انقلابی رومانیت ہے رجحان کے اعتبار سے ان کے افسانے زندگی کے دو بڑے اور اہم پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ جنسی گھٹن اور معاشی تنگدستی سے پیدا ہونے والے مسائل ان کے افسانوں کا مرکزی موضوع ہیں۔ ان کے افسانوں میں مشاہدے کی گہرائی، جزئیات نگاری اور

ب سے بڑھ کر احساس تنہائی کی گرد ملتی ہے۔ ایک طرف اپنی فطرت، خواہشات، تمنائیں اور دوسری جانب حالات کی ناہمواری اپنی فطرت کے خلاف ماحول میں زندہ رہنا، سمجھوتہ کرنا، انسان میں جس قسم کی تنہائی کے احساس کو پیدا کرتا ہے۔ سید خلیل احمد کے افسانے اس احساس کی عکاسی کرتے ہیں۔

۹۔ بیگم خورشید مرزا

بلوچستان میں اردو افسانے کے حوالے سے ایک نام بیگم خورشید مرزا کا بھی ہے انہوں نے بہت کم لکھا لیکن جتنے افسانے لکھے ہیں ان میں ان کا انداز تحریر صاف نکھرا ہوا اور دلچسپ ہے وہ ریڈیو پاکستان کوئٹہ میں بزم خواتین کے پروگرام میں حصہ لیتی رہی ہیں۔ اور ریڈیو میں کچھ فیچرز اور ڈرامے بھی لکھے ہیں بیگم خورشید مرزا کے یہاں ماحول اور ثقافت کے اعتبار سے مسائل کا عکس گہرا ہے۔ ان کے افسانوں میں بنیادی مقصد خواتین کے مسائل کو اجاگر کرنا ہے۔

افسانہ "رواج" یہ افسانہ "ساقی" کراچی افسانہ نمبر ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا ہے۔ فیض محمد دو شادیاں کرتا ہے۔ پہلی بیوی کتور کے یہاں ایک بیٹی حرمت خاتون اور تین بیٹے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن بیٹے اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں۔ اور فیض محمد اپنے چچا لال محمد کی مدد سے اپنی پھوپی زاد بہن فتح خاتون کی ۱۴ سالہ بیٹی بختاور سے دوسری شادی کرلیتا ہے۔ اور اس کے بدلے میں اس کے بھائی دین محمد کے ساتھ اپنی ۱۴ سالہ بیٹی حرمت خاتون کی شادی کردیتا ہے۔ اس طرح دونوں خاندان "لب" کی رسم کے تحت لڑکی خریدنے کی رقم سے بچ جاتے ہیں۔ لیکن ان بے جوڑ شادیوں نے دونوں خاندانوں کی زندگیوں کو ہروقت مصائب اور پریشانیوں میں مبتلا رکھا۔

بیگم خورشید مرزا نے اس افسانے میں کتور اور بختاور دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے جھگڑتے اور جلتے کڑتے دکھایا ہے۔ کتور کے یہاں کوئی اولاد نرینہ زندہ نہیں ہے اس لئے وہ اپنی سوکن بختاور کے بچے رحمتہ اللہ پر جادو ٹونے کرتی ہے۔ بلوچستان کے لوگ کیونکہ پیری مریدی کے قائل ہیں۔ اور انہیں جادو ٹونے پر پختہ یقین ہوتا ہے۔ اس لئے اس افسانے میں بھی اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اسی طرح لال محمد اپنی جیب سے جڑے والی نسوار کی ڈبیہ جیب سے نکال کر ایک چٹکی نسوار اپنے ہونٹوں اور دانتوں کے درمیان رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں کڑوالی چائے اور قہوہ کا استعمال دکھایا ہے۔ افسانے کے آخر میں چھوٹا بھائی بڑی بہن کا ... کا نظارہ کرتا ہے۔ یہ تمام باتیں بلوچستان کے رسم و رواج اور ان کے ماحول کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ بلوچستان

کے رسم و رواج کی برائیوں کے علاوہ خاص طور پر عورت کے ساتھ معاشرتی سطح پر ہونے والی ان ناانصافیوں اور ظلم کی عکاسی کی ہے جو بلوچستان کی معاشرت کا حصہ ہیں۔

"عورت نوری بھی ہے اور ناری بھی"۔ یہ افسانہ "ساقی" کراچی، نومبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا ہے۔ اس افسانے میں بھی بلوچستان کی غلط رسومات، غربت و افلاس اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ان کی پسماندگی اور کم علمی کو موضوع بنایا ہے۔ محمد انور کی بیوی مرجاتی ہے وہ دوسری شادی کرنے کے لئے اپنی سولہ سالہ بیٹی ہزاری کو ایک ہزار روپے میں ایک بوڑھے اور کانے فقیر کے ہاتھ فروخت کردیتا ہے۔ اور دوسری بیٹی فاطمہ کی شادی دونوں ٹانگوں سے معذور شخص سے کردیتا ہے۔ اور اس کے بدلے میں اس کی بہن سے اپنی شادی کرلیتا ہے۔

اس افسانے میں Man Dominating معاشرہ کو موضوع بنایا ہے۔ باپ اپنی بیٹیوں کے سودے کرتا ہے۔ لیکن اس کی نوخیز بیوی بھاگ جاتی ہے۔ ایک بوڑھے سے اسی طرح چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مرد اپنی انا کے لئے عورتوں پر زیادتی کرتے ہیں۔ اور جب عورت ردعمل ظاہر کرتی ہے۔ تو اسے بے وفا کہا جاتا ہے۔ جبکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔

افسانہ "آپی"۔ یہ افسانہ "ساقی" کراچی، سالنامہ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اس افسانے میں آپی کا کردار بہت ہمدرد، پرخلوص، شفیق و حلیم ہے۔ ان کی ۱۷ سال کی عمر میں شادی ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی سسرال میں ہر عمر کی لڑکیوں کے ساتھ بہت محبت سے پیش آتی ہیں۔ اپنے خاوند سہیل سے انہیں بہت عقیدت ہے۔ انہیں تو دو دیوتا سمجھتی ہیں۔ لیکن سہیل اپنا زیادہ وقت اپنے دوستوں کے ساتھ کلب میں گزارتے ہیں۔ رات کو بھی بہت دیر سے گھر آتے ہیں۔

یہ افسانہ بھی عورت کے مسائل کے گرد گھومتا ہے۔ اس افسانے میں عورت کے وہ مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ جو جذباتی فضا اور رویے سے تعمیر ہوئے ہیں۔ عورت مرد سے محبت کرتی ہے۔ اس کی مونس و غمخوار ہوتی ہے۔ وہ مرد کا سہارا چاہتی ہے۔ لیکن مرد عورت کی محبت کا جواب اسی جذباتی فضا اور صداقت کے ساتھ نہیں دیتا جس جذباتی فضا اور صداقت سے وہ محبت کرتی ہے۔ تو عورت کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ اس افسانے میں عورت اور مرد کے ان ہی جذبات و احساسات اور رقابت کی ترجمانی کی ہے۔

"چوڑی والا"۔ یہ افسانہ "ساقی" کراچی، سالنامہ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا ہے۔ اس افسانے میں خورشید

مرزا نے چوڑی والے کے کردار کی بہت اچھی عکاسی کی ہے۔ یہ افسانہ اگرچہ بہت مختصر ہے۔ لیکن جاندار ہے۔ اس میں بیگم خورشید مرزا نے یہ بتایا ہے کہ حب الوطنی اور مذہب سے لگاؤ ایک ایسے شخص میں بھی ہو سکتا ہے جسے عموماً حقیر سمجھا جاتا ہے۔ جیسے چوڑی والا۔ اس کالے کلوٹے لنگڑے لنجے کبڑے چوڑی والے کے میلے دانت پھٹے ہوئے جوتے ان سے میلے اور ٹیڑھے انگوٹھے کے ناخون کا جھانکتے رہنا اور سر پر میلی ترکی ٹوپی اور پھر اپنے مخصوص انداز میں اچک اچک کر چلتے ہوئے پھیری لگانا۔ اس کی جیتی جاگتی تصویر پیش کر دیتے ہیں۔

"روبی"۔ یہ طویل افسانہ "ساقی" کراچی ناولٹ نمبر ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کہانی میں انہوں نے ایک جہاز کا انتخاب کیا ہے کیونکہ ایسا ماحول اور بھانت بھانت کے لوگ اسی جگہ ممکن تھے۔ کسی محلے یا ریل گاڑی کے ایرکنڈیشن ڈبے میں نہیں۔ محلہ یا ریل گاڑی کے حوالے سے وہ فضا اور تاثر پیدا نہ ہوتا۔ جو اس بحری جہاز سے پیدا ہوا۔ نام "روبی" ہے جو ایک پندرہ سالہ ہندوستانی مسلم لڑکی ہے۔ اس افسانے میں خورشید مرزا نے عورت کی ذہنی پستی اور پسماندگی کو بیان کیا ہے۔ اس میں مسز افتخار شک کا شکار ہیں بلکہ وہ ہر ممکن کوشش کرکے یہ شک مسز نندکمار اور مسز مہتہ میں بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور اس میں قدرے کامیاب بھی رہتی ہیں وہ اپنے شوہر کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔

انہوں نے عورت کا دوسرا مرض حسد دکھایا ہے۔ یہ حسد بیگم افتخار میں اس قدر سرایت کر گیا ہے کہ وہ باپ بیٹی کو ہنستے بولتے برداشت نہیں کر سکتیں۔ بیٹی کی سالگرہ کا ہار دیکھ کر جل جاتی ہیں۔ اور سو باتیں بناتی ہیں۔ انہیں حسد اپنے سے الگ کچھ دیکھنے نہیں دیتا ورنہ وہ روزی کو یوں بے حیا اور بیرانہ سمجھتیں جبکہ وہ ایسی نہیں ہے وہ اپنے دکھ بھلانے میں مگن ہے۔

چندا اور روبینہ کی دوستی انسانی احساسات و جذبات پر مبنی ہے۔ مذہب اس میں کوئی دیوار نہیں۔ دونوں اپنی دقیانوسی ماؤں کو راہ راست پر لانے کے لئے پروگرام بناتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔

اس میں سمندر کے مناظر کی تصویر کشی بہت خوبصورت کی ہے۔ مصنفہ نے لفظوں میں تصویر بنا دی ہے۔

(۱) "یہ سمندر جس کی نہ کوئی ابتداء نظر آتی ہے نہ انتہا۔ دور افق پر آسمان جھکا ہوا اپنی گرم و گرد آلود پیشانی کو کس طرح سمندر کی ٹھنڈی موجوں سے تر کر رہا ہے۔ کس طرح آسمان کا ہلکا نیلا رنگ سمندر کے زیادہ گہرے رنگ میں اس طرح ملنے کی کوشش کر رہا ہے۔

۱۔ "روبی" بیگم خورشید مرزا، "ساقی کراچی" ناولٹ نمبر ۱۹۶۲ء، جلد نمبر ۶۵، شمارہ ۲

جیسے وہ دوئی کو مٹا کر ایک ہو جانا چاہتا ہو۔ سفید بادلوں کے ٹکڑے فرشتوں کے پروں کی طرح بے داغ و معصوم کیوں ہیں۔"

مجموعی طور پر بیگم خورشید مرزا نے افسانوں میں بلوچستان کی غلط رسومات، ان کی پسماندگی، خواتین کے مسائل خاص طور پر ان کے ساتھ معاشرتی سطح پر ہونے والی ناانصافیوں اور ظلم و ستم، معاشی تنگدستی اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کی بہت اچھی ترجمانی کی ہے۔ ان کے سب افسانے اصلاحی رجحان کے حامل ہیں۔

۷۔ عبدالرحمان غور

عبدالرحمان غور بلوچستان کے ایک اچھے ادیب اور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں مقامی رنگ حاوی ہے جس میں بلوچستان کے ماحول فضا اور یہاں کی تہذیبی روایات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ ان میں سیاسی و سماجی مسائل پیش کئے گئے ہیں۔ اور ان کی کہانیاں بھی روزمرہ زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا افسانہ "چار ہزار" ڈرامائی انداز میں لکھا گیا ہے۔ کہانی یوں ہے۔

ایک لڑکی کی شادی ایک عمر رسیدہ بزرگ سے چار ہزار روپے کے عوض طے پاتی ہے۔ وہ اپنی سہیلی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہے کہ اسے یہ شادی پسند نہیں ہے وہ اس شادی سے مرنا بہتر سمجھتی ہے لیکن اس کے والد نے چار ہزار روپے لے کر ضرورت کے تحت خرچ کر لئے ہیں اس کی سہیلی اسے سمجھاتی ہے۔

(۱) "اب رونا دھونا فضول ہے۔ صبر سے کام لو۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں کہ والدین کی رضامندی پر قربان ہو جاؤ۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) اور وہ چار ہزار بھی خرچ ہو چکے ہیں۔ ورنہ بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ اور پھر یہ کوئی ایسا پہلا واقعہ نہیں ہے کہ تم ہی پر گزرا ہو۔ ہمارے ملک میں زندگی کے اسٹیج پر بارہا ایسے ڈرامے کھیلے جا چکے ہیں۔ اور جب تک یہی بے راہ روی اور اندھی تقلید ہے تم جیسی معصوم اور بے گناہ جوان لڑکیاں قربان ہوتی رہیں گی (تیز آواز میں) یونہی بکتی رہیں گی اور گھٹ گھٹ کر جان دیتی رہیں گی۔ رو لو جی بھر کر رو لو۔ ظالموں کا ماتم مناؤ۔ ان کا سوگ رچاؤ!!!۔"

اس افسانے میں سماجی سطح پر ہونے والی ان ناانصافیوں کو اجاگر کیا گیا ہے جو بلوچستان کی معاشرتی زندگی کا حصہ ہیں۔ جس میں عورت کے ساتھ ظلم کو ظلم نہیں سمجھا جاتا۔ جہاں عورت کو انسان نہیں بلکہ جانور سمجھا جاتا ہے۔ جسے چند روپوں کے عوض شادی کے نام پر کسی کے سپرد کر دیا جاتا ہے اس افسانے میں بے جوڑ

۱۔ "چار ہزار" عبدالرحمان غور، ماہوار رسالہ "معظم" نومبر ۱۹۵۰ء، ص نمبر ۲۸

ہو۔ طاہر محمد خان کا اسلوب ان کی شخصیت کی طرح نکھرا ہوا اور شفاف ہے۔"

طاہر محمد خان کے افسانوں میں بلوچی معاشرے کی روایات بلوچستان کے موسم، فضائیں، غربت سے پیدا ہونے والے مسائل کا عکس بڑے فنکارانہ انداز میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔ ان کے یہاں رومانیت کا گہرا عکس ہے جس میں جنسی حقیقت نگاری اور معاشی زندگی کے مسائل کا ادراک ہے۔

یاسمین صوفی

یاسمین صوفی کا تعلق کوئٹہ سے ہے وہ کوئٹہ کی ایک کہنہ مشق ادیبہ تھیں انہوں نے ۱۹۵۸ء سے ادبی مضامین، تقاریر، ڈرامے اور ناول لکھنے شروع کیے تھے۔ ان کے مشہور ناول فریحہ، امائمہ، عاطقہ، چندا کا دل ٹوٹ گیا، اک کعبہ اور سہی، زخم حیات، آرزو، پھول اور پتھر اصلاحی و رومانی ناول ہیں۔

ان کی تحریر میں جذبوں کا گداز اور رنج والم ملتا ہے۔ ان ناولوں میں انہوں نے عورت کے جذبات کو بیان کیا ہے۔ ان کے ناولوں کی ہیروئن عورت کی عظمت کا سمبل ہے۔ جو ماں، بیوی، بیٹی ہے۔ لیکن وہ زندگی کے ہر دور میں قربانی دینے والی اور ضبط و صبر کا پیکر ہے۔

ان کی کتاب "فانوس ادب" ۱۹۶۶ء میں نیازی پبلشرز انارکلی لاہور نے شائع کی تھی۔ اس کا آغاز نظم سے ہوتا ہے۔ اس میں دس کہانیاں اور سات مضامین ہیں۔ ان کہانیوں میں ۱۹۶۵ء کے جنگ کے متعلق چھوٹوں اور بڑوں کے جذبات کو کہانی کے روپ میں بیان کیا گیا ہے۔

یاسمین صوفی نے کچھ افسانے بھی لکھے ہیں۔ مطبوعہ افسانے تو دستیاب نہیں ہو سکے بہت کوشش کے بعد ان کی بہن رقیہ سے دو غیر مطبوعہ افسانے "نصیب کے پھل" اور "لرزتے سائے" کے عنوان سے موصول ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے بعد میں چھپ جائیں۔

"نصیب کے پھل"۔ افسانے میں حبہ نام کی عورت کی داستان غم بیان کی گئی ہے وہ میٹرک کے بعد پڑھنا چاہتی ہے۔ لیکن اس کے والد لڑکی کو زیادہ پڑھانا پسند نہیں کرتے حبہ اپنے بھائی نوید کی مدد سے چوری چوری ایم اے اسلامیات کر لیتی ہے۔ اس کی شادی ندیم سے جو میٹرک پاس بھی نہیں ہوتا کر دی جاتی ہے۔ وہ حبہ پر ظلم و ستم کرتا ہے۔ آخر میں حبہ چولہا پھٹ جانے سے شدید زخمی ہو کر مرجاتی ہے۔

اس افسانے میں یاسمین صوفی نے غلط اور فرسودہ رسم و رواج، غربت و افلاس اور اس سے پیدا ہونے والے معاشی مسائل جہاں لڑکیاں خاندان پر بوجھ بن جاتی ہیں۔ عورتوں پر کیے جانے والے ظلم و ستم اور

ماخذ "بلوچستان میں اردو" ڈاکٹر انعام الحق کوثر

معاشرتی جبر کی ترجمانی کی ہے۔

ہمارے ہاں معاشرتی نظام میں Man Dominating معاشرہ ہے۔ جہاں مردوں کو عورتوں پر برتری حاصل ہے۔ جہاں مرد سربراہ ہونے کی حیثیت سے اپنی من مانی کرتے ہیں۔ ان معاشرتی قوانین اور اصولوں کی طرف بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ جو مرد اور عورتوں کے لئے مختلف ہیں اور جس کی بنیاد ناانصافی پر ہے۔ جہاں عورتوں کو چاردیواری میں قید کر کے انہیں تعلیم جیسی نعمت سے محروم رکھا جاتا ہے۔ جبکہ تعلیم نہ صرف عورت کے لئے بلکہ اس کے خاندان کے لئے بھی بہت ضروری ہے۔

یاسمین صوفی نے اس افسانے میں عورت کے ان ہی مسائل کی ترجمانی کی ہے۔

دوسرے افسانے "لرزتے سائے" میں بھی اسی انداز میں تین کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ اس افسانے میں جہالت، پسماندگی، توہمات اور عورتوں کے ساتھ ناانصافیاں و ظلم و ستم کی نشاندہی کی ہے۔ گھریلو مسائل فرسودہ رسم و رواج کو بہت مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔

یاسمین صوفی نے معاشرے کی جن برائیوں کو دیکھا ہے اسے مؤثر طریقے سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور خاص طور پر معاشرے کے ان پہلوؤں کی عکاسی کی ہے جو عورت کے ساتھ ناانصافی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ بلوچستان کے فرسودہ نظام اور روایات کی خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ وہ معاشرے میں عورت کو صحیح مقام دلانا چاہتی ہیں جہاں وہ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار آزادی کے ساتھ کر سکیں اور تعلیم حاصل کر کے جہالت سے پیدا ہونے والے اندھیروں کو ختم کر سکیں۔ ان کے افسانے اصلاحی رجحان کے حامل ہیں۔

خادم مرزا

خادم مرزا بلوچستان کے منفرد افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی کا عمیق مطالعہ و مشاہدہ شامل ہے۔ بیان میں سکون و ٹھہراؤ تہذیب و شائستگی کا وقار شامل ہے۔ ان کے افسانوں کا ایک ایک جملہ عورت اور مرد کی زندگی، رفاقت اور محبتوں کی کہانی سناتا ہے۔

بقول ڈاکٹر فردوس انور قاضی۔

(۱) "ان کے افسانے انسان کے اس پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔ جہاں عورت اور مرد ایک دوسرے کی تکمیل کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو سے آسودگی کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں۔ ان کے افسانوں میں احساس کی نزاکتیں، جذبوں کے مدوجذر اور داخلی کیفیات کی خوبصورت عکاسی ملتی ہے۔ ان کے افسانوں کا

۱۔ فردوس انور قاضی۔ غیر مطبوعہ۔

ایک ایک جملہ انسانی جذبوں کی بھول بھلیوں سے گزر کر تخلیق کار کے خون جگر سے سینچا ہوا نظر آتا ہے۔ خادم مرزا کے افسانوں کے کردار جس طرح سوچ رہے ہوں، جس طرح جی رہے ہوں۔ ان سب میں تخلیق کار کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے افسانہ نگاری کرتے وقت مقدار کی بجائے معیار کو پیش نظر رکھا ہے اور ایک ایک جملے پر ایک مکمل تخلیق کی حیثیت سے محنت کی ہے۔ "سات رنگ اور ایک گیان" میں شامل گیارہ افسانے ان کی تخلیقی زندگی کا سرمایہ ہیں۔ لیکن ان افسانوں میں شامل بہت سے فقرے ایسے ہیں جو زندگی کے تجربات، مشاہدات اور پوری زندگی کے دکھ سکھ اور سوچنے والے ذہن کی بھری قوتوں سے بھرپور ہونے کی سبب بذات خود ایک مکمل افسانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

ان کے افسانوں کا مجموعہ "سات رنگ اور ایک گیان" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ ان کا افسانہ "ریت میں گلاب" میں ایک غریب کلرک کی کہانی ہے وہ عقلمندی سے زندگی کو بہتر مقام تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن مہنگائی کی وجہ سے وہ اس میں ناکام رہتا ہے۔ وہ اپنے طبقے میں جو مقام حاصل کرنا چاہتا ہے وہ نہیں کرسکتا۔ تو وہ کنجوسی کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ وہ خلوص دل سے چاہتا ہے کہ اس کا اپنا گھر ہو۔ لیکن گھر بنانا بہت مشکل ہے اس گھر کی تعمیر کے لئے وہ دنیا کی خوشیوں سے منہ موڑ لیتا ہے۔ لیکن صرف پانچ ہزار ہی جمع کرپاتا ہے۔ تب وہ سوچتا ہے کہ مکان کی تعمیر کے لئے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو برباد و پامال نہیں کریگا اور کشادہ دستی سے کام لے گا۔ تنخواہ ملتے ہی وہ بیوی کے لئے برقعے کا کپڑا اور بچی کے لئے لباس و پھل خریدتا ہے۔ اور اپنی بیوی بچی کے سات خوش و خرم زندگی گزارتا ہے۔

خادم مرزا کے اس افسانے میں سکون، خوشی محبت اور خلوص کے جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔ وہ زندگی کے تلخ حقائق کو خندہ پیشانی سے برداشت کرکے ایک نارمل زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ انسانی زندگی کی ان خوشیوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جس پر اس کا حق ہے۔

"ہنسی پتوں اور سائے"۔ افسانے میں رومانوی اور معاشی رجحان غالب ہے۔ اس افسانے میں کسی سیاسی افراتفری کے موقع پر ایک میاں بیوی نکلے ہوئے ہیں۔ راستے میں کسی وادی میں گردان لگاکر بیٹھ جاتے ہیں۔ بیوی حاملہ ہے اس لئے ان کا سفر رک گیا۔ وہ کسی جائے امن کی تلاش میں ہیں اس عالم میں خاوند کو گولی لگ جاتی ہے بیوی اس کو وہیں دفن کردیتی ہے۔ اس کے بعد اس کے ہاں بچہ جنم لیتا ہے اور وہ ننی اور خوبصورت

زندگی کی امیدیں اس سے وابستہ کرلیتی ہے۔ بیوی کا نام ہنسی ہے اور اپنے بیٹے کا نام پتوں رکھتی ہے۔ اور اس کی آنکھیں آئندہ زندگی کے حسین خواب دیکھتی ہیں۔ یہ خواب امن اور محبت کے خواب ہیں۔ جو زندگی کو امن اور انسان دوستی کے راستے پر ڈال سکیں۔ اور جینا اتنا دشوار نہ رہے۔

خادم مرزا نے انسانی زندگی کے غیر معمولی واقعات کو بھی بے ساختہ فطری اور سچے واقعات میں ڈھال کر پیش کئے ہیں۔

(۱) "لمبے اور نوکیلے سایے یوں بڑھنے لگے جیسے مغرب کی اور سے کسی بڑے عفریت کی شہ پاکر بس دوڑے چلے آرہے ہوں.... صحرا میں پھیلی ہوئی ریت کی سسکیاں..... اور بڑھتے ہوئے سایوں کی سانس کی آواز سے خوفزدہ ہوکر..... بیوی نے چلتے چلتے خاوند کی کلائی دونوں ہاتھ سے تھام لی۔"

خادم مرزا مناظر فطرت کی عکاسی کرتے وقت بھی انسانی جذبوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ انہوں نے فطرت کی کہیں بھی بغیر ضرورت کے عکاسی نہیں کی ہے۔ بلکہ مناظر فطرت ان کے افسانوں میں ضرورت بن جاتے ہیں۔ اور وہ ان میں صدیوں کی بیتی ہوئی داستان سناتے ہیں۔ اور قاری ان کے افسانوں میں اس قدر محو ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔

"تیرا گھر"۔ اس افسانے میں مغربی تحریکات میں سے سیریلزم کی تیکنیک استعمال کی گئی ہے۔ کہانی کچھ یوں ہے ایک ننھا بچہ ہے وہ آم کے درخت کے پاس جاتا ہے اور وہ درخت کا جائزہ لیتا ہے۔ وقت گزرتا رہتا ہے۔ آخر وہ بوڑھا ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد وہ تنہا ہوجاتا ہے۔ اپنے گھر واپس جاتا ہے۔ تو ایک شخص کو اپنے گھر میں موجود پاتا ہے۔ وہ کیکر کے چھلکوں سے حقہ جلا رہا ہوتا ہے۔ وہ اس شخص سے اس کے گھر میں آنے کی وجہ پوچھتا ہے۔ تو وہ شخص اس کو حقہ پینے کے لئے دیتا ہے۔

(۲) "لو حقہ پیو!" اس شخص نے چلم جماتے ہوئے کہا۔

"یہ سب نئی بستیاں .... اور نئی لوگ ہیں ..... تم اپنی کہو.... اب ڈاکو بنوگے یا درویش .... کیونکہ تیسری صورت میں تمہیں نیا گھر اسارنا ہوگا...."۔

اس افسانے میں جگہوں کے بدلنے کا عمل ہے پہلے وہ خود بچہ ہوتا ہے۔ سکول سے اٹھتا ہے۔ جوان ہوتا ہے۔ اس کی بچی ہوتی ہے۔ اس کو ڈولی میں بٹھاکر رخصت کرتا ہے اور وقت کا دھارا بہتا رہتا ہے۔ اس میں

۱- "ہنسی پتوں اور سائے" مجموعہ "سات رنگ اور ایک گیان" خادم مرزا ص نمبر ۲۵۔
۲- "تیرا گھر" مجموعہ [illegible]

سرمایہ دارانہ نظام کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ دنیا میں دو گھر ہیں ایک سرمایہ دارانہ نظام اور دوسرا غریبانہ۔ وہ تیسرا گھر بنانا چاہتے ہیں۔ جہاں سکون و آرام ہو اعتدال ہو اور جہاں انسان کی شناخت ہو سکے۔

خادم مرزا نے اپنے افسانوں میں غیر معمولی اور فطری ضرورت کو بہت فطری اور سچے انداز میں پیش کیا ہے۔ دراصل خادم مرزا کے افسانے شدید قسم کی رومانیت سے مملو ہیں۔ اس افسانے کی کہانی میں نئی تیکنیک استعمال کی گئی ہے۔ خواہشات اور خوابوں کے ذریعے اس افسانے کی کہانی بنتی ہے۔ جو زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔

"زمین کی گرہ"۔ یہ افسانہ سرآب جامعہ بلوچستان سے شائع ہوا ہے۔ اور افسانوی مجموعے "سات رنگ اور ایک گیان" میں بھی شامل ہے۔ دنیا میں دوسری جنگ عظیم کے بعد چھوٹی چھوٹی علاقائی جنگیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ خاص طور پر ایشیا اور افریقہ میں جس میں انسان سر چھپانے کے لئے مسلسل سرگرداں ہے۔ اس قسم کی گوریلا نما جنگیں ان علاقوں میں بھی ہو رہی ہیں جہاں رسل و رسائل کے عام ذرائع بھی مفقود ہیں۔ اس افراتفری کا شکار ایک بوڑھی ماں اور اس کا نوجوان بیٹا ہے۔ جو اپنے گاؤں میں پیدل مسافت جھیلتے ہوئے اپنی بیٹی اور بہن کے گاؤں کی طرف جا رہے ہیں۔ لیکن بیٹی کا گھر ابھی کچھ فاصلہ پر ہے اور ماں اس قابل نہیں ہے کہ سفر جاری رکھ سکے۔ بیٹا ماں کو چٹان کے پاس بٹھا کر تسلی دیتا ہے کہ وہ رات بھر میں بہن کے گھر پہنچ کر اپنے بہنوئی کو اور ایک چارپائی لے کر آئے گا جس پر اسے لٹا کر بہن کے گھر لے جائے گا۔ پانی کا انتظام بھی وہ کر دیتا ہے تاکہ ماں سوکھی روٹی بھگو کر کھاتی رہے۔ وہ بہن کے گھر پہنچتا ہے تو سارا گاؤں جلا ہوا ہے۔ اور وہاں کوئی شخص بھی موجود نہیں ہے۔ لوگ یا تو مارے گئے ہیں یا وہاں سے کہیں چلے گئے ہیں۔ وہ لڑکا ذہنی طور پر اتنا پریشان ہے کہ وہ وہاں سے زندہ میمنا اٹھا کر بغل میں دبائے سفر جاری رکھتا ہے اور راستے میں پرانے مندر کے پاس جائے امن بجھتے ہوئے میمنے کو آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ کیونکہ وہ دنیا کے حالات سے اس قدر متنفر ہو جاتا ہے۔ کہ وہ کسی نامعلوم جگہ کے لئے چلتا رہتا ہے اس کے نزدیک دنیا ایک بے معنی سی چیز بن جاتی ہے۔ اور وہ اس کے آخری دن کے انتظار میں چلتا رہتا ہے۔ آخر کار زمین بھونچال کی زد میں آجاتی ہے۔

اس افسانے کا کردار انسان کی علامت ہے۔ جو آخری وقت تک سفر میں ہوگا اور انجام نے کسی بھی نئے آغاز کے لئے آنا ضرور ہے۔ افسانے میں امن کے حسن اور بدامنی کی بدصورتی کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ماضی کے تمام خوابوں سے انحراف کیا گیا ہے۔ اس دنیا کے حالات بدلیں گے نہیں یہاں ایسے ہی دکھ

اٹھانے پڑیں گے۔

خادم مرزا کے افسانے علامتی انداز کے حامل ہیں جس میں زندگی کے اسرار و رموز فلسفہ اور انسانی خواہشات، جذبات، احساسات اور خواب ہیں، جو افسانے کی فضا کو مکالموں اور کرداروں کی وساطت سے انوکھے رنگ اور کسی نئے پہلو کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ان کے افسانوں میں شدید قسم کی رومانیت ہے جو جنسی جذبات اور عنفوان شباب کے رومانی جذبات سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔

"کاجل کا شہتیر"۔ یہ افسانہ موضوع کے لحاظ سے اچھا افسانہ ہے اس میں پس ماندہ علاقوں کی معاشی سرگرمیوں کا ذکر ملتا ہے۔ کچھ علاقے جو پس ماندہ ہوتے ہیں تو اکثر اوقات مرد محنت مزدوری کے سلسلے میں غیر ملک چلے جاتے ہیں۔ تاکہ ان کی معاشی حالت بہتر ہو جائے اور وہ مشترکہ خاندان کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ تو ان کی عورتیں بھی خاندان کے ساتھ رہتی ہیں۔ لیکن شادی شدہ عورتیں جب تنہائی اور فراق کی زندگی گزارتی ہیں تو ان پر فراق کے جذبات کا غلبہ رہتا ہے۔ فراق میں انسان کے جذبات رومانی ہو جاتے ہیں۔ اور وہ بہک جاتا ہے۔ اس افسانے میں پرکاش کور ایک ایسی ہی عورت کی کہانی ہے جس کا خاوند بلونت سنگھ محنت مزدوری کے سلسلے میں باہر گیا ہوا ہے۔ اور وہ تنہائی و فراق کی زندگی گزار رہی ہے اور پھر فراق وداع ایسی صورت میں ڈھل جاتی ہے کہ انسان کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ کل کیا ہونے والا ہے۔

بقول ڈاکٹر فاروق

(۱)"خادم مرزا کے افسانوں میں اسی لئے عورت کی چہل پہل زیادہ ہے کہ یہ عورتیں حیات انسانی کو مستقبل کی طرف لے جا رہی ہیں نسوانی جسم کا شعور گھن زدہ خیالات اور اعمال سے نکل کر جب تخلیقی کرب میں ڈھلتا ہے تو زندگی کی کئی وضاحتیں خود بخود سمجھ میں آنے لگتی ہیں۔ خادم مرزا نے نسوانی جسم کے تقاضوں کے پیچھے اس روح کو ٹٹولا ہے جہاں تخلیق حیات اپنے وجود کا اظہار چاہتی ہے۔ عورت اگرچہ آج تک ایک معمہ ہی ہے لیکن عورت کے باطن کی اتھل پتھل کو خادم مرزا نے بڑی قدرت اور فنکاری سے پیش کیا ہے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خادم مرزا نے عورت کو مرد کی نگاہ سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ عورت کے جذبات و احساسات اور اس کی طبقاتی سطحوں کی سوچ

۱۔ "کالے کوس سے اودھر" دیباچہ 'ڈاکٹر فاروق احمد' "سات رنگ اور ایک گیان" "خادم مرزا" ص نمبر ۱۸۔۱۹

کو جس عمدگی سے انہوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اتنی آگہی سے شاید کوئی عورت خود بھی نہ لکھ سکے۔"

(۱) "تم سب پتہ نہیں کونسی جنگ لڑ رہے ہو۔ اور پتہ نہیں کونسی شانتی ڈھونڈ رہے ہو۔ پر تمہیں اپنے گھر کی جنگ کی کوئی خبر نہیں۔"

اس افسانے میں خادم مرزا نے ایک عورت کے دکھوں اور درد کی بڑی اچھی فنکارانہ تشریح کی ہے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب فنکار خود بھی دکھوں میں ڈوبا ہوا ہو۔ خادم مرزا ایسے ہی فنکاروں میں سے ہیں۔ ہم ایسے افسانوں کو کاجل کا شہتیر کہہ سکتے ہیں۔ اگر کاجل کا شہتیر نہ کہیں تو پھر آنکھ کا شہتیر کہنا پڑے گا۔ رجحان کے اعتبار سے اسمیں رومانوی اور اصلاحی رجحان غالب ہے۔ خادم مرزا کے افسانے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ وہ کسی نظریے کے اسیر نہیں ہیں۔ انہوں نے زندگی کو جیسے دیکھا جس طرح سمجھا جیسے محسوس کیا اسی طرح پیش کر دیا۔ ان کے ہاں افسانے ماضی' حال اور مستقبل کی قیود سے آزاد ہیں۔ اقبال کی طرح انہوں نے بھی زندگی کو پیمانہ امروز و فردا سے نہیں ناپا ہے۔ وہ تو صرف وقت اور حال کی کہانی سنا رہے ہیں۔

بقول ڈاکٹر فاروق احمد

(۲) "خادم مرزا کے افسانے پڑھ کر آپ کو یقیناً یہ احساس ہوگا کہ افسانے اپنے عہد کے عکاس ہو کر بھی اپنے وقت میں محصور نہیں ہیں۔ ماورائے بدن زندگی کی حقیقت اگر کسی لطافت کا احساس پیدا کرتی ہے تو یہ افسانے اس لطافت کی طرف ہمیں متوجہ کر لیتے ہیں۔ آپ نے بیدی اور منٹو کو تو پڑھا ہوگا انہوں نے کہیں بھی لفظوں کی فضول خرچی نہیں کی اور کہیں بھی جذبے اور فکر کی شدت کو کم ہونے نہیں دیا۔ انہوں نے جو کچھ کہا پورے یقین' ٹھہراؤ اور گمبھیر انسانی فکر کے زیر اثر کہا۔ موضوعات تو ان کے چھوٹے ہی تھے۔ لیکن نتائج بہت اعلیٰ اور انسانی فطرت کے قریب تھے دوسری طرف قرۃ العین حیدر کی پوروں پر پانچ ہزار سال کی انسانی تاریخ اور تہذیب ثبت ہے۔ وہ انسانی تہذیب کے اس سفر میں جس مقام سے بھی قلم اٹھاتی ہیں اسے اپنے کام حق سے ادب کا بیش بہا حصہ بنا دیتی ہیں۔ خادم مرزا کے افسانوں میں اردو افسانوں کے دو بڑے رجحانات یکجا ہو گئے ہیں۔ ایک طرف اس کے یہاں قرۃ العین حیدر کی تحریروں جیسا تاریخی اور تہذیبی سفر ہے اور دوسری طرف

۱۔ "کاجل کا شہتیر" "سات رنگ اور ایک گیان" خادم مرزا' ص نمبر ۷

۲۔ "کالے کوس سے ادھر" دیباچہ ڈاکٹر فاروق احمد' مجموعہ "سات رنگ اور ایک گیان" خادم مرزا' ص نمبر ۲۰

خادم مرزا کے افسانے منٹو اور بیدی کے اختصار کی خوبیاں سمیٹے ہوئے ہیں۔"

مجموعی طور پر خادم مرزا کے افسانے زندگی کے گہرے کرب مادی حقائق اور جنسی مسائل پر مبنی دکھ کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کی روزمرہ یکسانیت کے عمل سے بیزاری کا احساس ہے ان کے افسانوں میں جسمانی تقاضوں اور روحانی کرب کی تصاویر ملتی ہیں۔ زندگی کو انہوں نے جس زاویے سے دیکھا پرکھا اور برتا وہی تحریر ان کے افسانوں کی بنیادی کہانی ہے۔ خادم مرزا کے افسانوں میں زندگی کے متعلق ان کے مطالعے اور مشاہدے کی گہرائی کا عکس نظر آتا ہے۔ انہوں نے یہ افسانے علامتی انداز میں بھی لکھے اور بیانیہ انداز میں بھی ان کے افسانوں میں کہانی پن اور دلچسپی کا انداز ہے جو افسانے کے لئے بنیادی اہمیت کی بات ہے۔

خادم مرزا کے افسانوں میں منظر نگاری کا کمال ہے منظر نگاری میں نہ صرف وقت اور لمحوں کی خوشبو پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہے بلکہ اس ماحول اور فضا سے کردار کی شخصیت سے اٹھنے والی مہک اور گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان کے افسانوں میں غربت اور معاشی تنگدستی سے پیدا ہونے والے مسائل کرداروں کی وساطت سے بڑی خوبی کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ معاشی اور جنسی مسائل کی خوبصورت آمیزش سے وہ اپنے افسانوں کی بنت کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی افسانہ نگاری کو فرائڈ یا مارکس سے فیض اٹھا کر افسانہ نگاری کے فن کو محدود کیا جس طرح بیسویں صدی کے ان دو بڑے مفکروں نے زندگی کے ان دو بڑے پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ سوچ کے دائرے وسیع کئے اس کا اثر شعوری یا غیر شعوری طور پر خادم مرزا نے قبول ضرور کیا لیکن زندگی کو جنسی اور معاشی خانوں میں تقسیم کر کے دیکھنے کے ادھورے عمل کا وہ شکار نہیں ہوئے۔ انہوں نے زندگی کے ہر پہلو کو اپنے تجربات اور مشاہدات کے آئینے میں دیکھا۔ اور اپنے افسانوں میں اسے پیش کر دیا۔

ان کے افسانے فنی اعتبار سے تکمیل کا احساس دلاتے ہیں۔ بلوچستان کے لکھنے والوں میں خادم مرزا کا نام اہم ناموں میں سرفہرست ہے۔

ظفر مرزا

ظفر مرزا نے طالب علمی کے زمانے سے افسانے لکھنے شروع کئے تھے۔ کالج میگزین "ماہ نو" اور دوسرے رسائل میں ان کے افسانے چھپتے رہے ہیں۔ آپ کالج میگزین "بولان" کے ایڈیٹوریل بورڈ (حصہ اردو) کے رکن رہے ہیں۔ ظفر مرزا ریڈیو پاکستان سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ ریڈیو پاکستان خضدار کے اسٹیشن ڈائریکٹر

بلوچستان میں اردو افسانہ ۱۹۷۱ء کے بعد

اس سے قبل دوسرے باب میں ہم بلوچستان کے ۱۹۷۱ء سے پہلے کے افسانہ نگاروں کا جائزہ لے چکے ہیں۔ جن میں انور رومان، عبدالرحمن غور، طاہر محمد خان، سید خلیل احمد، خادم مرزا کا جائزہ پیش کیا گیا۔ بحیثیت مجموعی یہ تمام افسانہ نگار رومانوی رجحان کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ لیکن زندگی کو دیکھنے، برتنے اور محسوس کرنے کا زاویہ سب کا اپنا ایک منفرد انداز رکھتا ہے۔ سید خلیل احمد کے افسانوں میں رومانیت کی رو جاری و ساری ہے۔ لیکن اس میں زندگی کے تلخ تجربات، جنسی اور معاشی مسائل کا ملا جلا عکس نظر آتا ہے ان کے افسانوں میں عمیق مطالعے کی وسعت ہے جس کے سبب ان افسانوں میں فکری زاویہ حاوی ہے۔ ان افسانوں کے کردار کائنات کے وسیع پس منظر میں زندگی کو سوچتے، برتتے اور جھیلتے ہیں۔

طاہر محمد خان کے یہاں زندگی کا عملی پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ ان کے افسانوں میں گہرائی حقیقت نگاری نے زندگی کی عملی تصاویر پیش کی ہیں ان کے افسانوں میں زندگی کے فریم سے حاصل کی گئی گہری گہرائی کہانیوں کا عکس نمایاں ہے جو زندگی کے مختلف دکھ مسائل اور معاشرتی حوالوں سے زندگی کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں رومانیت کے خوبصورت پس منظر سے جنسی اور دیگر معاشرتی مسائل جھلکتے ہیں۔ خادم مرزا کی رومانیت میں جذباتی وفور داخلی جذبوں کی صداقت، فضا، ماحول اور وقت کی چاپ اور خوشبو پھیلی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جبکہ عبدالرحمان غور کی رومانیت میں کائنات کے حسین رنگ، عورت کے ساتھ ہونے والی معاشرتی زیادتیوں اور ظلم کا احساس حاوی ہے غرض ۱۹۴۷ء کے بعد ۱۹۷۱ء تک بلوچستان کی افسانہ نگاری میں رومانیت کا عمل کارفرما رہا۔ خواہ اس میں معاشرتی، معاشی ناہمواریوں کا تذکرہ ہو۔ یا جنسی مسائل کی نشاندہی ہو۔ بحیثیت رومانوی رجحان کے اعتبار سے بلوچستان میں اردو افسانہ نگاری کا یہ دور رومانی دور کہا جا سکتا ہے۔

۱۹۷۰ء۔۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کا انقطاع ہوا۔ اتنی قربانیوں کے بعد حاصل ہونے والے ملک کا نصف حصہ چھن جانے کا یہ سانحہ پاکستانی قوم کے لئے ایک انتہائی تکلیف دہ سانحہ تھا۔ اس سانحہ کے اثرات عوام کے ساتھ ساتھ ادیبوں اور شاعروں نے زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کئے اردو افسانہ نگاری پر اس کے اثرات بہت گہرے مرتب ہوئے۔ بلوچستان کے افسانہ نگاروں کے یہاں اس موضوع پر اکا دکا افسانے

لکھے گئے لیکن اب وہ دستیاب نہیں۔ بحیثیت مجموعی اس سانحہ کو لے کر یا ایسے موضوع بناکر زیادہ نہیں لکھا گیا۔ اس کا تھوڑا بہت عکس بلوچستان کے اہم افسانہ نگاروں کے یہاں ملتا ہے۔ خصوصاً خادم مرزا کا افسانہ "سات رنگ اور ایک گیان" میں اس سانحہ کا دکھ شامل ہے۔

تاہم ۷۰ کے دہائی میں جو افسانہ نگار بلوچستان میں اردو افسانہ نگاری کے حوالے سے سامنے آئے ان میں اہم نام ڈاکٹر فردوس انور قاضی، معین الحق آغا گل کے شامل ہیں۔

ڈاکٹر فردوس انور قاضی

بلوچستان کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ڈاکٹر فردوس انور قاضی کا ہے انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۷۱ء میں ایم اے کیا۔ وہ اپنے کالج کے زمانے سے افسانہ نگاری کررہی ہیں۔ ۶۵ء۔۶۶ء میں ان کے کچھ افسانے کالج میگزین میں چھپ چکے ہیں۔ ۱۹۷۱ء سے انہوں نے باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز کیا اس زمانے میں ان کے بیشتر افسانے اردو ڈائجسٹ، سیارہ ڈائجسٹ میں خصوصی اشاعت کے طور پر شائع ہوئے۔ ۱۹۷۵ء میں انہوں نے شعبہ اردو جامعہ بلوچستان میں تدریس کا آغاز کیا اس عہد میں ان کے بیشتر افسانے افکار کراچی، قدریں، حیدر آباد فنون لاہور میں شائع ہوئے۔

۱۹۸۵ء میں انہوں نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا۔ "اردو افسانہ نگاری کے رجحانات" یہ اردو افسانہ نگاری کی تاریخ ہے جس میں ۱۹۰۰ء سے لے کر موجودہ دور تک اردو افسانہ نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ جائزہ نہ صرف عہد بہ عہد افسانہ نگاروں کے فن، تاریخی تسلسل میں تحقیقی کام ہے۔ بلکہ عہد بہ عہد بدلتے رجحانات ان کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی مسائل کو افسانے کے فنی بنتر میں دیکھا گیا ہے۔ چھپنے کی دشواریوں کے سبب ۱۹۸۵ء میں تکمیل پانے والا یہ مقالہ ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ یہ اردو افسانہ نگاری کی تاریخی کتاب ہے جس میں تاریخی تسلسل کے ساتھ افسانہ نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا۔

ڈاکٹر فردوس انور قاضی نے اب تک صرف ۲۵۔۳۰ افسانے لکھے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ ان کو روایتی انداز میں کسی فن پر دسترس حاصل کرنے یا نام نمود کے لئے کسی خاص میدان میں سبقت حاصل کرنے کے شوق سے زیادہ نئے نئے تجربے کرنے میں زیادہ دلچسپی رہی ہے۔ اردو افسانہ نگاری میں انہوں نے نیا تجربہ کیا جس میں انہوں نے ماضی، حال اور مستقبل کی قید سے آزاد ہمہ وقت گردش کرنے والے خیالات کو کہانی کا پیکر عطا کرنے کی کوشش کی۔ اور اس کا نام "خیالیہ" رکھا۔ ۷۶۔۹۰ کے دوران ان کے بیشتر خیالیے

کراچی میں شائع ہوئے ان کے تتبع میں شمناز پروین اور انگلش ڈیپارٹمنٹ جامعہ بلوچستان کی مہ جبین نے چند خیالیے لکھے۔

۱۹۹۰ء میں ڈاکٹر فردوس انور قاضی کا ناول خوابوں کی بستی شائع ہوا۔ اس میں بھی انہوں نے نیا تجربہ کرنے کی کوشش کی۔ سیاست اور ادب کی آمیزش سے انہوں نے پاکستان کی سیاسی صورت حال معاشی مسائل اور تعلیمی پس ماندگی کی وجوہات کو ناول کا موضوع بنایا اس میں پاکستان بننے کے وقت ہجرت کرکے آنے والے طبقے اور پاکستان کے چاروں صوبوں میں رہنے والے طبقوں کے درمیان تعلقات معاشرتی مسائل اور ذہنی سفر تضادات، اختلافات، غلط فہمیاں اور ان کی وجوہات کو کہانی کا پیرایہ عطا کرکے ناول کے روپ میں پیش کیا۔

انہوں نے افسانہ نگاری میں ایک اور نیا تجربہ کرنے کی بھی کوشش کی اقبال کی بعض مشہور نظموں کے مرکزی خیال کو افسانے کا روپ دیا۔ اور اس طرح اقبال کے افکار و نظریات کو کہانی کے روپ میں پیش کیا۔ یہ کہانیاں سہ ماہی قلم قبیلہ کوئٹہ، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۳ء میں بال جبریل کی ایک نظم "زمانہ حاضر کا انسان" کے نام سے اور اخبارات میں شائع ہوئیں ان کا مقصد اقبال کے افکار و نظریات کو کہانی کے روپ میں طلباء تک پہنچانا تھا۔ موجودہ دور میں وہ ایک اور نیا تجربہ کرنے کی کوشش کررہی ہیں۔ انہوں نے مصرعوں کی شکل میں افسانے لکھے افسانے کو آزاد نظم کا روپ دیا۔ ان کے نظمیہ افسانے "دل اور میں" "جنات رقص کرتی ہے"۔ اور دیگر افسانوی نظمیں شائع ہو چکی ہیں۔

ان تجربات کے قطع نظر بحیثیت مجموعی وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں ان کے افسانوں میں بنیادی رجحان رومانوی صداقت اور حقائق پر مبنی ہے۔ ان کی حساس طبعی نے نچلے طبقے کے مسائل کا جائزہ پیش کیا جس میں جنسی معاشی اور معاشرتی مسائل پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ جنسی موضوعات کو انہوں نے بعض ترقی پسندوں کی طرح اس انداز میں پیش نہیں کیا جس میں جنسی موضوعات کو پیش کرنے کے لئے جنس کا مکمل کھلا اظہار جنسی تلذذ پرستی کی شکل میں ڈھل کر سامنے آتا ہے۔ انہوں نے منٹو اور عصمت کے انداز کو اپنانے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے اس قسم کے موضوعات میں بھی مشرقی انداز اور رنگ حاوی ہے۔ ضرورت کے تحت ہر موضوع کو اختیار کیا یہاں تک کہ جنس کے موضوعات کے تحت انہوں نے ان مسائل کو بھی پیش کیا جس سے معاشرتی ناہمواریوں کا شکار اس معاشرے میں عورت کو گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن ان موضوعات میں ضرورت کے تحت غزل کے رمز و کنایہ کے انداز میں وہ اس مسئلہ کو ملفوف پیرائے میں پیش کردیتی ہیں۔

ان کے افسانوں میں داخلی جذبوں کی صداقتوں کا عکس گہرا ہے۔ وہ گیرائی حقیقتوں سے گزر کر داخلی جذبوں تک قاری کو پہنچانے کے ہنر سے وابستہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی کی تصاویر کا ایک سلسلہ ہے جس میں کردار کی بظاہر اچھائی یا برائی پر افسانہ نگار کا براہ راست تبصرہ نہیں ملتا۔ بلکہ ان کے افسانے ان معاشرتی عوامل اور محرکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جو انسان کے داخلی جزبوں پر اثر انداز ہو کر اسے بناتے بگاڑتے ہیں۔

ڈاکٹر فردوس انور قاضی کا مشاہدہ بہت گہرا ہے وہ جو کچھ دیکھتی ہیں۔ محسوس کرتی ہیں نہایت فنکارانہ انداز میں بیان کردیتی ہیں۔ ان کی حساس طبیعت نے پاکستان کے سیاسی' معاشرتی اور تہذیبی تغیرات کے جو اثرات عوام پر اثر انداز ہوئے ہیں اسے جس طرح دیکھا محسوس کیا اپنے ناول "خوابوں کی بستی" میں بے ساختہ اظہار کیا ہے۔ انہوں نے اس ناول میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ حقداروں کا حق دلانے کے لئے معاشرے کی ناانصافیوں اور بے راہ رویوں کے خلاف مقابلہ کیا جائے۔ ان کے ناول کے اکثر کردار متوسط اور غریب طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں انسان دوستی کا جوہر موجود ہے۔ رباب کے کردار میں ڈاکٹر فردوس نے زندگی کے ایسے کردار کی تشریح کی ہے۔ جس میں انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور اسے کیا ہونا چاہئے۔ ان کے اس ناول میں ادب اور سیاست میں امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناول میں تعلیمی مسائل اور تعلیمی اداروں کی زبوں حالی کا بھی بہت خوبی کے ساتھ اظہار کیا ہے۔

انہوں نے اپنے سفر کا آغاز افسانے سے ہی کیا ہے۔ وہ ناول نگار کے مقابلے میں ایک کامیاب افسانہ نگار نظر آتی ہیں۔ اور ان کا شمار اردو کے اچھے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانے فنی معیار کے اعتبار سے بلند ہیں اور ان کی تحریر پختہ ہے۔ ان کے ذاتی مشاہدات اور تجربات ان کے افسانوں کی بنیاد ہیں۔ ان کے افسانوں میں سچائی اور حقیقت کی تلاش ملتی ہے وہ چیزوں کو سرسری یا سطحی طور پر نہیں دیکھتی ہیں بلکہ ہر چیز کا گہرا مشاہدہ کرتی ہیں۔ اس لئے ان کے افسانے انسان کو اندر سے جھنجھوڑ کر ان کو بیدار کرتے ہیں۔ افسانے کی تعریف کے مطابق ان کے افسانے اتنے مختصر ہوتے ہیں کہ ایک نشست میں پوری دلچسپی کے ساتھ پڑھ لئے جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی کہانی میں افسانہ ہی ملتا ہے۔ وہ بہت محتاط ہو کر لکھتی ہیں۔ ان کے افسانے پڑھتے وقت قاری بوریت کا شکار نہیں ہوتا۔ بلکہ محظوظ ہوتا ہے۔ ان میں وہ تمام موضوعات ہوتے ہیں جن کا زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ دراصل ان کے افسانوں میں دوسرے افسانہ نگاروں سے ہٹ کر ایک مختلف

انفرادی رنگ رومانیت کا ہے جو کہانی کو افسانہ بناتی ہے اس لئے ان کے افسانے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ ان کا افسانہ "سفید قمیض" ایک شاہکار افسانہ ہے اس میں ایک نوجوان ہے جس کی آمدنی بہت قلیل ہے اور اس کے پاس صرف دو سفید قمیضیں ہیں جن کو وہ باری باری دھو کر پہنتا ہے۔ ایک روز اس کے گھر کے سامنے ایک مجمع آتا ہے اور ایک شخص اسے سفید قمیض دکھا کر پوچھتا ہے کہ یہ اس کی قمیض ہے اور وہ سفید قمیض کے لالچ میں جھوٹ بولتا ہے کہ یہ سفید قمیض اس کی ہے اور بعد میں اسے قمیض میں لپٹا ہوا بچہ دکھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر فردوس انور قاضی نے یہ افسانہ بہت خوبصورتی اور فنکارانہ تجربہ کاری سے لکھا ہے اس افسانے میں انہوں نے غریب طبقہ کی گندی اور کچی آبادی کی منظر کشی کی ہے ان لوگوں کی محبت نفرت ان کے دکھ سکھ غم و خوشی بہت خوبی سے بیان کئے ہیں اور افسانہ اتنا مختصر ہے کہ پانچ سات منٹوں میں پڑھا جاسکتا ہے۔ اور خوبی یہ ہے کہ یہ افسانہ جولائی ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی وہ ذہن میں بالکل تازہ معلوم ہوتا ہے۔

"دھلی ہوئی سلیٹ" میں بنیادی خیال غربت ہے۔ غربت اور جنس کے مسائل پر تو منٹو اور عصمت نے بھی لکھا ہے لیکن یہ موضوعات ایسے ہیں جن پر اگر بے تکلف قلم اٹھایا جائے تو ادبی حسن جاتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس انور نے نہایت فنی مہارت سے یہ افسانہ لکھا ہے ان کے افسانوں میں ظلم اور بدی سے نفرت کا اظہار ملتا ہے۔ ان کے افسانوں میں نصیحت کے بجائے رومانیت ہے جو کہانی کو دلچسپ بناتی ہے۔ اور افسانہ پڑھتے وقت قاری کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔

اسی طرح ان کا افسانہ "آخری رات" موضوع کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے اس میں بہنوئی اور سالی کے رشتے اور اس پس منظر میں داخلی جذبوں کی عجیب و غریب صداقتیں ہیں۔ کس طرح دل بہتے ہیں۔ اجڑتے ہیں۔ تقدیر کیسے کھیلتی ہے اور انسان کس طرح کھلونا بنتا ہے۔ اور کس طرح اس کا انجام بھی نہایت بھیانک اور خوفناک ہوتا ہے۔ اس افسانے میں جنسی موضوع ہوتے ہوئے بھی خالص جنسی نہیں تھا بلکہ انسان کے فطری جذبے اس کے تقاضے معاشرتی روابط کے پس منظر میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

اس افسانے میں ڈاکٹر فردوس انور قاضی نے رومان پرستی کے ساتھ ساتھ سماجی زندگی کے تلخ حقائق کی طرف نشاندہی کی ہے اس افسانے میں انہوں نے بڑے دلکش انداز میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

افسانہ "جونک" بھی ایک اچھا افسانہ ہے اس افسانے میں بھی غربت اور انسان کے کچلے ہوئے جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔ اس میں کرمو اپنے سوتیلے بیٹے کے ساتھ بہت ظلم کرتا ہے اسے بہت بری طرح مارتا پیٹتا ہے آخرکار اس کی بیوی اسے اپنے بھائی کے پاس لے جاتی ہے لیکن وہ گھر پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتا ہے۔

(۱) "جونک" کرمو کی نشے میں ڈوبی تیز سرگوشی ابھری لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا اور اسے روئی کی طرح دھننے لگا اور مار تا ہی چلا گیا کچھ دیر تو اس نے پٹائی کی شدت کو محسوس کیا پھر چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا پھر کیا ہوا اسے کچھ پتہ نہ چلا"۔

ڈاکٹر فردوس انور قاضی کا یہ افسانہ بھی بہت دلکش ہے ان کے افسانوں میں رومان اور حقیقت ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہیں جیسے زندگی میں اس کا عکس ملتا ہے۔ ان کا مشاہدہ گہرا ہے زندگی کے حقائق پر ان کی گہری نظر انہیں جزئیات سے کل کی طرف لے کر چلتی ہے۔ انہوں نے سماجی مسائل کو اپنے افسانے میں بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ فردوس انور قاضی کے افسانوں میں معاشرے کے دکھ پنہاں ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار معاشرتی زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔

ان کے بہترین افسانوں میں "روح کا سناٹا" "دھلی ہوئی سلیٹ" "محبت کا عظیم تاج محل" "تاوتیج" "آخری رات" "آخری شکار" "سفید قمیض"۔ شامل ہیں یہ تمام افسانے مختلف وقتوں اور مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ فردوس انور قاضی کے افسانے خارجی عوامل کے ذریعہ داخلی صداقتوں تک لے کر جاتے ہیں۔ ان افسانوں کے موضوعات معاشرے کے دکھ درد اور غم کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار گھریلو معاشرتی زندگی کے سماجی پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے موضوعات پر افسانے لکھے ہیں۔ ہر ایک موضوع کا اپنا الگ رنگ اور فضا ہے۔ لیکن انہوں نے نچلے اور غریب طبقے کے مختلف مسائل پر جن میں ان کے کچلے ہوئے جذبات بھی شامل ہیں بھرپور عکاسی کی ہے۔

فردوس انور قاضی نے "خیالیہ" کی نئی تیکنیک میں جو افسانے لکھے ان کے ذریعہ انہوں نے خیالات کو کردار کے روپ میں پیش کیا اور بعض اوقات "خیالیہ" میں انہوں نے حقیقی ہیرو کے بجائے اپنا ہیرو پراسرار روح کو بنایا ہے اور سوچوں کی بنیاد بعض اوقات مختلف ماحول، موسم اور موسیقی کی دھن کوئی گیت وغیرہ بن جاتے ہیں۔ ان سوچوں میں بعض اوقات تسلسل ہوتا ہے اور بعض اوقات تسلسل کے بغیر اظہار ہوتا ہے۔ لیکن ان میں ایک خاص قسم کی اندرونی تنظیم ہوتی ہے جو "خیالیہ" کو عام افسانوں سے بھی زیادہ دلچسپ بنادیتی

۱۔ "جونک" ڈاکٹر فردوس انور قاضی، نئی قدریں، ص ۱۷۲

ہے۔

"خیالیے" میں مرکزی کردار بالعموم تصور کی مدد سے تراشا ہوا کردار ہے۔ یہ کردار کبھی کبھی ہیرو کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ "خیالیے" کی اس نئی صنف (جس کی موجد خود فردوس انور قاضی ہیں) کا کمال یہ ہے کہ اس میں ایک عورت کے ان جذبات اور احساسات کو اظہار کا موقع مل جاتا ہے جو معاشرتی جبر اور تنہائی کی شکار عورت کے اندر گھٹ گھٹ کر کبھی کبھی بیماری یا جھلاہٹ کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ خیالیے میں بالعموم وہ خواب یا تصور کردار کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ جس کو انٹلکچول عورت اپنی تکمیل کے لئے ضروری سمجھتی ہے اپنی تیکنیک اور اثرپذیری کے لحاظ سے "خیالیہ" ایک اہم صنف ہے۔

"خیالیہ" میں طریقہ کار منفرد ہے اس میں ایک انٹلکچول عورت کی گفتگو ابھر کر سامنے آتی ہے جو وہ اپنے ہی جیسے کسی کردار سے کرنا چاہتی ہے۔ مگر اس تیکنیک میں انفرادیت یہ ہے کہ وہ کردار بھی تخیل کی مدد سے تراشا ہوا کردار ہے جو اس عورت کے دکھ کو سمجھتا ہے محسوس کرتا ہے اور اس کے ذہن میں ابھرنے والے سوالات کے جواب دیتا ہے۔ ایک ایسا کردار جس سے تنہائی کا شکار وہ عورت گفتگو کرتی ہے جو سوچتی ہے جو زندگی کے وسیع پس منظر میں اپنے جذبوں کی شدت ادھورے پن اور اپنے اندر موجزن محبت کے جذبے کا اظہار چاہتی ہے یہ کردار جس سے ایک انٹلکچول عورت محبت کرتی ہے گفتگو کرتی ہے۔ حقیقی کردار نہیں ہے بلکہ تخیل کی مدد سے تراشا ہوا کردار ہے اس کردار کو تخیل کی مدد سے تراشنا بذات خود مکمل تنہائی اور دکھ کی منہ بولتی تصویر کشی اور تنہائی کی علامت ہے۔

ڈاکٹر فردوس انور قاضی کے "خیالیے" دو دن، اجنبی، دھند لکے، خواب اور حقیقت، سونے کی چوڑیاں، روح کا سناٹا، آمد بہار میں خودکلامی کے ذریعہ خیالات افکار اور نظریات کا ایک سیل رواں ہے جو سامنے آتا ہے۔ بعض خواب یا افکار جن کا اظہار معاشرتی اصول و قوانین اور پابندیوں کے سبب عورت کے لئے مشکل ہو سکتا ہے۔ اور جس قسم کے جذبات و احساسات کا اظہار ناول یا افسانے میں مشکل تھا وہ خیالیے کے ذریعہ باسانی ممکن ہو سکا۔ ان کے "خیالیے" دھند لکے، خواب اور حقیقت میں انہوں نے اس طرح اظہار کیا ہے کہ بارش ہو رہی ہے ایک چھوٹی بچی پرانی حویلی میں جاتی ہے اس کے ذہن میں مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ جن کے وہ جوابات چاہتی ہے۔ لیکن اسے کوئی بھی مطمئن نہیں کر سکا۔ اس پرانی حویلی کے اس خالی کمرے میں روح آتی ہے۔ دراصل یہ روح نہیں بلکہ یہ کردار بھی تصورات کے سارے

زاشہ ہوا کردار ہے جس کے ذریعہ وہ گفتگو ممکن ہوتی ہے۔ جو عام زندگی میں ایسا حقیقی کردار نہ ہونے کے سب ممکن نہیں تھا۔ وہ کردار مختلف اوقات میں سامنے آتا ہے۔ اور جذبوں کی نزاکت لئے مختلف سوالات اور ان کے جواب کا سلسلہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس انور قاضی کا یہ "خیالیہ" بہت ہی دلچسپ ہے ان کے یہ عام افسانے سے بھی زیادہ خوبصورت اور جاندار خیالیہ ہے۔

ڈاکٹر فردوس انور قاضی نے مصرعوں کے ذریعہ بھی افسانے لکھنے کی کوشش کی ہے انہوں نے مشہور ادبی رسالے قلم قبیلہ میں خصوصی شمارہ جنوری تا جولائی ۱۹۹۶ء جلد ۶' شمارہ ۱۔ ۲' ص نمبر ۱۳۲ پر نمونے کے طور پر پروین شاکر پر لکھی ہوئی نظم پیش خدمت ہے۔

(۱) "وہ تھی عورت مگر خوشبوؤں میں بسی ایک خوشبو تھی۔

زندگی کے حسین راز سے باخبر
وہ تھی عورت مگر خوشبوؤں میں بسی ایک خوشبو۔
زندگی کے حسین راز سے باخبر
لالہ آسا مگر' ایک خوشبو ہی تھی
اس کے لہجے میں تھا
شوق کی پرخطر وادی جان فزا کا سہانہ سفر
منزلوں کے نشان
خواب بنتی سی آنکھیں
نظر کا فسوں
وہ تھی عورت مگر خوشبوؤں میں بسی
ایک خوشبو ہی تھی۔

....

اس نے تہذیب کے جھوٹے رنگوں میں لپٹے ہوئے فیصلے
سب ہی رد کر دئے
جس میں تفریق تھی مرد و زن کے لئے

....

فطری جذبات کی مضطرب لہر سے
پھر بنایا تھا گلرنگ حسین اِک محل
اس محل کے سفر میں وہ تنہا نہ تھی
اس کا محبوب تھا

....

جس کی پر لطف باتوں میں خوشبو کا رنگ
اور
مے کا خمار
نرم لہجوں کی جھولا جھلاتی فضا۔
بھیگتی رات اور چاندنی کا فسوں
یاد میں بھی تھا جس کی
بہاروں کا رنگ
اس کی آہٹ کے جاں سوز
لمحات میں
سینکڑوں دھڑکنوں کی
ہر اک تال پر
رقص کرتے ہوئے یوں ہی "شاکر" رہی
اور سجدے کئے
پھر بھی
وہ مرد تھا
جس کی فطرت ازل سے تھی
بھنورا صفت

۱۔ پروین شاکر "مصرعوں میں افسانے" ڈاکٹر فردوس انور قاضی' سہ ماہی "قلم قبیلہ" ۱۹۹۶ء ص نمبر ۱۳۲۔

جو وفا کی اداؤں سے تھا
بے خبر
زندگی کے ادھورے سفر میں کبھی
ہمسفر ہو کے بھی
اس کی بھنورا صفت
قوتِ فکر میں
گھر کی خوشبو کا احساس
جاگا نہیں
وہ تھی عورت مگر
زیست کے دکھ بھرے
شب چراغوں کی روشن تپش میں
وہ تنہا سلگتی رہی۔
صدیوں پر محیط
اپنے خلوت سرا خانہ دل کی
پیاسی زمین کے لئے
گیت بنتی رہی

....

یوں بھی حوا کی تخلیق کا
ایک سبب
بابا آدم کی دل بستگی کے لئے
بندگی کے لئے
ایک بہانہ ہی تھا
جو کہ دام کو آقا بنانے کی خواہش کا تھا سلسلہ

کیونکہ
حوا بیچاری کی قسمت میں تھا
داسی بننا لکھا
دائمی پیاس اس کا مقدر بنی
اور آدم
وہ آوارہ بادل بنا
جس کو سیراب کرنا ہی مقصود تھا
اسی کے لئے ہفت قلزم بنے
جبکہ حوا بیچاری وہ پیاسی زمین
جس کی تقدیر بادل کی محتاج تھی

....

اور
حوا کی بیٹی ہی ؟ "پروین" تھی
ان کے چہرے میں لالہ کے پھولوں کا رنگ
ان کے آنچل میں سمٹی ہوئی پتیاں
پھول ٹوٹے ہوئے رنگ بکھرتے ہوئے
ہجر کی شب گزیدہ سحر کے لئے
سینکڑوں سلسلے
ان گنت زاویے

....

اب کریں کیا گلہ
قادرِ کن فکاں
پھول کی زندگی تو

سدا نئی رہی

چند روز اب اس کی شکایت ہو گیا۔

اور "خوشبو" بکھرنے کا

کیوں ہو گیا؟

....

چاند کال ہوا

چاند کال ہوا

ڈاکٹر فردوس انور قاضی کے افسانے ہیئت کے اعتبار سے دو واضح رویے لئے ہوئے ہیں۔ ایک رویہ ٹوس کھرائی حقیقت پسندی کا ہے جس میں جذبات کی آمیزش بیدی کے افسانوں کی طرح مؤثر سماجی اور معاشرتی تصاویر پیش کرنے پر قادر ہے۔ اس قسم کے افسانوں میں "تاوبج" "سفید قمیض" "شکستہ دروازہ" "دھلی ہوئی سلیٹ" "کنکھجورا" "آخری رات" "آخری شکار" "محبت کا عظیم تاج محل" "ایک رات" وغیرہ جیسے افسانے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس قسم کے بیشتر افسانے ۷۰ کی نصف دہائی میں لکھے گئے ۷۵ کے بعد ان کے افسانوں میں ایک نیا زاویہ پیدا ہوا جس میں ان کے نئے تجربے کے تحت لکھے گئے افسانے شامل ہیں جن کو انہوں نے خیالیہ کا نام دیا۔ اس قسم کے افسانوں میں ذہنی کیفیتوں کو مجسم کیا گیا ہے۔

سوال و جواب کے پیرائے میں وہ گفتگو جو سوچنے والا ذہن کرنا چاہتا ہے۔ سوچ کے مختلف رخ جو زمان و مکان کی قیود سے آزاد ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ کائنات گیر سوالوں کا بوجھ اور ذہنی پیاس کو مٹانے کے لئے تخیل کی مدد سے تراشہ ہوا وہ کردار بھی ان افسانوں میں نظر آتا ہے۔ جس سے مل کر خود کلامی ہمکلامی میں تبدیل ہو سکے۔ تخیل کی مدد سے تراشہ ہوا یہ کردار ہی اس قسم کے افسانوں کا طرہ امتیاز ہے۔

ایسی فضا میں فردوس انور قاضی نے کچھ افسانے بھی لکھے ہیں۔ جو بظاہر تخیلاتی اور ماورائی فضا کے حامل ہیں۔ ایسے افسانوں میں حقیقت کی تلخیاں اور زندگی کے عجیب و غریب رخ کھل کر سامنے آتے ہیں۔ عورت اور مرد کے رشتوں کے درمیان جذباتی وارفتگی، ادھوراپن، محبت کے انوکھے رنگ، سچائی کے دکھ سب وضاحت کے ساتھ ایک خوابناک فضا میں اپنے پر کھولتے جاتے جاتے انسانی ذہن کی پیچ در پیچ گتھیاں، نفسیاتی شدائد کی غمناکی اور معاشرتی ناہمواریوں سے پیدا ہونے والے دکھ ایک ایک کر کے سامنے آتے ہیں اور ان

کی غیر مرئی پرتیں انکشافات کے آئینے میں جھلکتی رہتی ہیں۔

ان کا افسانہ "آخری ٹرین" اسی قسم کا افسانہ ہے جس میں موجودہ دور کی بے سمتی غیر قانونی طریقوں سے حاصل کی گئی دولت کی ریل پیل، مغربی تہذیب کی نقالی سے پیدا ہونے والی وہ گھریلو فضا ابھر کر سامنے آئی ہے جس میں والدین کے امریکہ کے دورے۔ وہاں سے آنے والے تحائف، شراب و کباب کی محفلیں پوپ موسیقی کی چیخیں چنگھاڑتی آوازوں کے درمیان ایک ایسے بچے کی نفسیاتی کیفیت کو پیش کیا گیا ہے جو رشتوں کے دکھ اور محبتوں کی پیاس میں بھٹکتا ہوا ماں باپ اور بہن بھائیوں کی محبتوں کو تلاش کرتا ہے۔ وہ ایسی گھریلو اور محبتوں سے بھرپور فضا کا متلاشی جہاں اسے ماں کی ممتا اور باپ کے پیار کی گرمی اور بہن بھائیوں کی رفاقت اور محبت کا گداز حاصل ہو سکے۔ لیکن اس تمام کی بجائے چکا چوند کرتی مصنوعی روشنیاں ٹیڑھے منہ کر کے انگریزی بولتے نو دولتے مہمان پوپ موسیقی کی اعصاب شکن آوازوں اور شراب کی بو سے ابھرتے نیم تاریک سے ماحول میں ڈوبے یہ تمام رشتے اسے تنہائی کا شکار بنا دیتے ہیں۔

محبت کی خوشبو تلاش کرتا بھٹکتا یہ بچہ جس کے لئے یہ فضا اجنبی ہے اعصابی تناؤ کا شکار ہو کر مہمانوں کے سامنے پوپ موسیقی کی آوازوں اور شور شرابے سے تنگ آ کر کیسٹ کو نکال کر توڑ پھوڑ دیتا ہے اس کے بعد ماں باپ اور بہن بھائیوں کی خوفناک نگاہیں۔ مار پیٹ آیا کا آ کر بچانا مہمانوں کی سوالی نگاہیں اور ماں کا یہ کہنا کہ آیا کا بچہ ہے۔ اس موقع پر ماں کے اس جواب پر باپ کی تشکر آمیز نگاہیں، ایک ایک چیز زندگی کا بھیانک روپ بن کر بچے کو ڈسنے لگتے ہیں۔ مصنوعی اور محبتوں سے خالی اس ماحول میں وہ بظاہر ابنارمل لگتا ہے لیکن درحقیقت وہی ایک ایسا سچا اور حقیقی کردار ہے جو جھوٹ، تصنع اور اندھی تقلید کے اس ماحول سے سمجھوتہ نہیں کر سکا جس کی شخصیت کے حقیقی رنگ اتنے گہرے اور پکے ہیں کہ ان پر کوئی دوسرا غیر حقیقی رنگ آ ہی نہیں سکا۔

"آخری ٹرین" ایک علامتی افسانہ ہے اس میں آخری ٹرین اس بوسیدہ غیر حقیقی اور مصنوعی ماحول میں اس شاندار تہذیب کا عکس پیش کرتی ہے جس کی شکل مسخ ہو چکی ہے جو اپنی تہذیبی، روایتی اور مذہبی شان و شوکت کھو چکی ہے۔ جس کے چہرے پر نہ آنکھیں ہیں جو دیکھ سکیں نہ کان ہیں جو سن سکیں۔ یہ وہ تہذیب ہے جہاں پوری قوم علم، محنت اور تہذیبی رویوں کے بغیر ترقی یافتہ اقوام کی نقالی میں بے سمتی اور بے راہ روی کا شکار ہیں۔ محض دولت کی پوجا کو زندگی کی حقیقت سمجھ بیٹھی ہے۔ "آخری ٹرین" کا مرکزی کردار اس پورے ماحول سے سمجھوتہ نہیں کر سکا وہ یہ سب چھوڑ کر اس آخری ٹرین میں بیٹھ جاتا ہے جس میں سفر کرتے چند ہی لوگ

ہیں۔ یہ ٹرین شائستہ اور ماضی کی روایات کا ٹوٹا پھوٹا اور لنگڑاتا ہوا محض ایک عکس ہے۔

یہ افسانہ بھی غیر مرئی اور ماورائی فضا کا حامل ہے جو حقیقی زندگی کے تلخ حقائق کو علامتی انداز میں بحسن و خوبی پیش کرتا ہے۔ وہ کردار جو اس ماحول اور فضا سے سمجھوتہ نہیں کر سکا۔ جسے اس ماحول اور فضا نے ابنارمل سمجھ کر رد کر دیا۔ وہ اس آخری ٹرین میں بیٹھ کر چلا جاتا ہے۔ جو اس بکھری ہوئی بوسیدہ تہذیب کی علامت ہے۔ جو کبھی شاندار روایات کی حامل تھی۔ لیکن جسے موجودہ عہد کی بے سمتی، کم علمی اور مغرب کی اندھا دھند نقالی اور احساس کمتری نے بدرنگ اور بے چہرہ بنا دیا ہے۔ اس افسانے کا آخری ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

(ا) "بیٹھے بیٹھے اس نے پہلو بدلا اور سامنے دیکھا اس کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ ریلوے لائن کے برابر بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے لیمپ نما بلب روشن تھے۔ درختوں کے پتوں میں دھیمی دھیمی سرسراہٹ کے ساتھ پورا اسٹیشن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ سامنے جعفریوں والے گھر میں نیلی روشنی کا چھوٹا سا بلب روشن تھا۔ اسی لمحے میں نے سنا کہ کوئی گاڑی آ رہی ہے۔ رات کے سناٹے میں ریل کی آواز گونج اٹھی۔ شور تیز ہو تا گیا۔ نزدیک آتے آتے ریل اسٹیشن پر خاموشی سے رک گئی۔

یہ بہت خستہ حال گاڑی تھی اس کا رنگ مکمل طور پر اڑ چکا تھا۔ اس کی آمد پر نہ اسٹیشن بیدار ہوا۔ نہ ہنگامہ پیدا ہوا۔ اور نہ ہی شور جاگا۔ بس چاروں طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ اس گاڑی میں سوار ہونے والا نہ کوئی مسافر تھا اور نہ اس میں موجود مسافر اترنے پر آمادہ دکھائی دیتے تھے۔

اس نے بڑی تیزی سے اپنا بندھا ہوا بستر اٹھایا اس کے جسم میں جانے کہاں سے پھرتی آ گئی تھی۔ جیسے اسٹیشن پر بار بار ابھرنے والا طوفان اس کے تن وجود میں سمٹ آیا ہو۔ وہ بڑی افراتفری میں اٹھا۔ بھاگا اور گاڑی پر سوار ہو گیا۔

گاڑی اپنی خستہ حالی پر کراہتی چیختی لڑکھڑاتی اسے لئے کسی انجانی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔"

معین الحق

بلوچستان کی افسانہ نگاری میں معین الحق ایک اہم نام ہے۔ وہ ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں ان کے

ا۔ "آخری ٹرین" ڈاکٹر فردوس انور قاضی "اخبار جہاں" ۱۴ جنوری ۱۹۸۵ء ص نمبر ۲۷۔

افسانوں میں نئی نرالی اور خیالی دنیا نہیں ہے بلکہ وہ روزمرہ زندگی میں جو مشاہدہ کرتے ہیں۔ محسوس کرتے ہیں۔ بے کھٹکے کہانی کا رنگ دے دیتے ہیں۔ انہوں نے افسانوں کے علاوہ طنز و مزاح پر مبنی مضامین بھی لکھے ان کے افسانے سلجھے ہوئے ذہن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان واضح اور سلجھا ہوا ہے۔ ان کے ہاں تخیلاتی حسن کاری کے بجائے حقائق کے بیان کو ترجیح حاصل ہے۔ ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری کا رجحان ہے جس میں بیشتر موضوعات معاشی حقائق پر مشتمل ہیں۔ معاشی ناہمواریاں، مفلسی کا جبر اور مفلسی سے پیدا ہونے والے مسائل ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ ان کے افسانوں میں جنسی موضوعات بھی ہیں۔ لیکن ان کا منبع و مرکز بھی مفلسی یا معاشی ناہمواریوں سے پیدا ہونے والے مسائل ہیں۔

ان کے افسانوں کا مجموعہ "تاریکیاں" جو ۱۴ افسانوں پر مشتمل ہے ان کے افسانوں میں انسانی زندگی سے محبت اور ہمدردی کا احساس ملتا ہے۔ ان افسانوں میں نہ حسن و عشق کا ذکر ہے اور نہ ہی ہیروئن کے بناؤ سنگھار پر صفحات بھرے گئے ہیں بلکہ عاشقانہ انداز کے بجائے ان کے کردار ضرورت کے تحت ایک دوسرے سے ملتے ہیں کیونکہ ان کی نگاہ میں ایسے کردار ٹھوس نہیں ہوتے ان میں بناوٹ و تصنع ہوتا ہے۔ معین الحق کے افسانوں کے کردار عام انسان ہیں۔ اس کی مثال "طالب" "تاریکیاں" اور "مصلوب رشتے" ہیں "مصلوب رشتے" افسانہ میں ریشم خان اس کی بہن اور ماں بہت تنگدستی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے پاس کھانے پینے کے لئے بھی کچھ نہیں ہے اتفاق سے اس وقت اس کا بہنوئی انار گل گھر آتا ہے۔ لکڑیوں کی ضرورت کے تحت وہ لکڑیاں چننے کے بہانے شہناز کو باہر لے جاتا ہے اور پھر

(ا) "اس نے اپنی بانہوں میں شہناز کو لے لیا۔ شہناز کسمسائی لیکن اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ فضا میں اک سسکی ابھری۔ رشتوں اور انسانیت کے سوکھے پتے جل کر بھسم ہو گئے ایک لٹ گیا اور دوسرے نے تسکین پائی۔"

اس افسانے میں معین الحق نے غربت و افلاس اور اس ظلم کے خلاف احتجاج کیا ہے جو ظلم مردوں نے عورت پر ڈھایا ہے یہ مرد عورت کی جسمانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اپنی جنسی اور حیوانی خواہشات کی تسکین کے لئے عورت پر ظلم کرتے ہیں۔ ان عورتوں پر سب سے زیادہ ناانصافی اور ظلم جنسی حوالوں سے کیا گیا ہے۔ یہاں معین الحق نے مردوں کے اس ظلم کی نشاندہی کی ہے۔ ریشم خان شہناز کا بھائی اپنی بہن کے اس ظلم کا بدلہ اپنے بہنوئی انار گل سے ۷ سال بعد اس کی نئی بیوی سے لیتا ہے۔ یہاں بھی عورت پر ہی ظلم

ا۔ "تاریکیاں" معین الحق ص نمبر ۴۴

ہوتا ہے۔ مردوں کی یہ ناانصافی صدیوں سے عورت پر ظلم کرتی چلی آ رہی ہے۔ مرد مرد سے جب انتقام لیتا ہے۔ تو انتقام کے نام پر بھی وہ اپنی ہوس کی آگ ہی بجھاتا ہے۔ وہ اپنی بہن اور بیٹی پر ہونے والے ظلم کا بدلہ بھی دوسرے کی بہن اور بیٹی پر ظلم کر کے لیتا ہے۔ اس کے علاوہ عورت کے ساتھ سب سے زیادہ ظلم اور زیادتی ہمیشہ جنسی حوالے سے کی گئی معاشرتی سطح پر ناہمواریوں کا شکار ہمیشہ عورت کو ہی ہونا پڑا آج بھی جنسی اعتبار سے عورت پر حد سے گزری ہوئی پابندیاں اور مرد کی آزادانہ روش نے معاشرتی سطح پر عورت کے ساتھ جو ناانصافیاں کیں یا معاشی تنگدستی کے سبب پیدا ہونے والے مسائل میں شادی کے مسئلے اور رکاوٹ کے مردوں کے اندر سبب پیدا ہونے والی زندگی کا شکار بھی کسی طریقے سے عورت کو ہونا پڑا۔ اس کی جھلک معین الحق کے افسانوں میں کہیں کہیں اپنی جھلک دکھاتی ہے۔

افسانہ "تاریکیاں" میں بھی دلوتی ایک بیوہ ماں ہے وہ اپنے بیٹے کرم خان کی پرورش محنت مزدوری اور تنگدستی سے اس امید پر کرتی ہے کہ یہ بڑا ہو کر اس کا سہارا بنے گا۔ لیکن اس کی آوارگی نے اس کی ساری امیدیں خاک میں ملادیں وہ لوگوں کے برتن مانجھ کر اور کپڑے دھو کر جو پیسے لاتی ہے کرم خان چرس پینے میں خرچ کر دیتا ہے اس افسانے میں ملا کا کردار بھی بہت لالچی اور مکار دکھایا گیا ہے۔ وہ بھولی بھالی عورتوں کو تعویز دے کر رقم بٹورتا ہے وہ کرم خان کو بہلا پھسلا کر مولوی بنانے کی دعوت دیتا ہے اس کام کے لئے وہ اس کی ماں سے ۳۰۰ روپے بٹورتا ہے۔

یہاں ملا کا کردار دیکھئے

(۱)"ہم تعویز کیسے لکھے گا۔ ہم کو ا۔ ب کے بعد صرف دس تک گنتی آتا ہے"

کرم خان بے چینی سے بولا......

"بے وقوف، تعویز کھول کر کون پڑھتا ہے خانے بنا کر الٹا سیدھا لکھ دینا"۔ ملا نے کرنجی آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ ہم تمہارا شاگرد ہو گیا آج سے..... پر ملاجی کوئی مسجد خالی نہیں۔"

"مسجد کی فکر نہ کرو ہمارے پر چھوڑ دو پگڑی دے کر خالی کرا لے گا۔ پگڑی تم دو گے اور مال آدھا آدھا ملا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

۱۔ "تاریکیاں" معین الحق، ص نمبر ۴۱۔۴۲

مال آدھا آدھا یہ کیا بات ہوا کرم خان نے کہا۔

"بے وقوف پیسے کا بات نہیں کرتا" ملا نے کہا۔

"پھر"؟

"تم تو سمجھتا نہیں۔ احمق ہے خر ہے۔ رنگ رنگ کی زنانی آئے گا سمجھا۔ بس لین..... کرو اس کے ساتھ"

اس افسانے میں معین الحق نے ملا کا کردار بہت مکار اور لالچی دکھایا ہے۔ اور مکالماتی انداز میں پیش کیا ہے۔ افسانے کے اس حصے میں معاشرے کا ایک نیا رخ ابھر کر سامنے آیا ہے۔ مکالموں میں زبان شستہ ہونے کے بجائے بے تکلف دیہاتی اور اجڈ استعمال کی ہے۔ انہوں نے دوسرے افسانے طالب، ملاخوں کے پیچھے اور پورے دن میں بھی یہی انداز اختیار کیا ہے۔

افسانہ "خان بادشاہ" میں خان بادشاہ اپنی بیٹی کو جہیز دینے کے لئے بیمہ کی رقم پانچ ہزار روپے حاصل کرنے کی غرض سے موت کو گلے لگا لیتا ہے۔ وہ اپنے دوست منصور کو خط لکھتا ہے۔

(۱) "منصور بھائی میں ہار گیا ہوں..... دنیا سے ان کے کڑے رسم و رواج سے..... اس ہار کا سبب میری بچیاں ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے میرے پاس بہت دولت ہے 'آخر اتنا بڑا اور پرانا پولیس آفیسر ہوں۔ میں اپنی جان دے رہا ہوں.... تم انشورنس کی رقم بچیوں کی شادی پر لگا دینا۔ پشاور والا ایک مکان کرائے پر دے دینا۔ تاکہ خرم اور اورنگ زیب کی پڑھائی ہو سکے ان کی دیکھ بھال تم کرنا۔ بھائی بن کر دکھانا۔ وعدہ کیا تھا نا تم نے.... وعدے کا پاس رکھنا۔ یہ راز ہے جس کے رازداں صرف تم ہو کوئی اور نہ جان سکے۔ یہ میری طرف سے گلو اور نازو کے لئے تحفہ ہے۔ ایک باپ کا آخری تحفہ۔"

معین الحق کے افسانے کے اس ٹکڑے میں دنیا کے ان رسم و رواج اور مجبوریوں کا اظہار ملتا ہے۔ وہ بیٹی کے لئے جہیز کے جذبات سے مجبور ہو کر خودکشی کر لیتا ہے۔ معاشرے کے یہ تلخ حقائق ہیں جو ایک باپ کو جان دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا افسانہ ہے۔ اس میں معین الحق نے بلوچستان کی علاقائی زبان بھی استعمال کی ہے دراصل بلوچستان میں اردو ایسی ہی انداز میں بولی جاتی ہے ان کا یہ انداز ایسا سحر کن ہے کہ قاری پڑھتے وقت دلچسپی محسوس کرتا ہے۔

۱۔ "خان بادشاہ"، "تاریکیاں" معین الحق، ص ۲۹

افسانہ "رنگ برنگے انڈے" میں رحیمہ ایک اوباش قسم کی عورت ہے جو کار بنگلہ رکھنے والے اور بیرون ملک سے ٹرپ پر آنے والے مردوں کے ساتھ گلچھرے اڑاتی ہے۔ اس کی دو بیٹیاں ہیں جن کی اس نے شادی کر دی۔ اس کا خاوند میرزمان اپنی آنکھوں سے اس کی بدکرداریوں کو دیکھتا ہے۔ کڑھتا ہے مگر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جب وہ ستر سال کے قریب ہوگئی۔ تو ایک سرکاری آفیسر ملک داد کو پھانس لیتی ہے۔ اور میرزمان کی موت کے بعد اس سے شادی کرلیتی ہے۔

ایک دن ناشتے کی میز پر چار مختلف رنگ کے انڈے پلیٹ میں رکھے تھے۔ ملک نے اس روز خلاف معمول دو کے بجائے چار انڈے کھالئے جو مختلف رنگوں میں تھے۔ تو رحیمہ نے مسکرا کر اس سے کہا۔

(۱) "آج دو کے بجائے چار کیوں۔"؟

"بس رنگ بہت اچھے لگے" ملک نے جواب دیا۔

مجھے بھی رنگ اچھے لگتے ہیں۔ حالانکہ ذائقہ اور خاصیت ایک ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح... میں مردوں کے معاملے میں ورائٹی پسند کرتی ہوں... یہاں انڈوں کا رنگ تمہیں بھایا۔ مجھے بھی رنگ بھاتے ہیں۔ ان رنگوں کا نام ہے دولت.... لذت..... تمہیں اندازہ نہیں نئے شخص کو ہنڈل کرنے اور اسے بیوقوف بنانے میں کتنا مزہ آتا ہے دولت مند مرد میرے لئے رنگ برنگ کے انڈے ہیں۔ اور بس۔ جیسے ان رنگوں نے تمہیں چار انڈے کھانے پر مجبور کیا اسی طرح لذت اور دولت کی کشش مجھے ان مردوں کی طرف مائل کرتی ہے۔"

اس افسانے میں عورت کی بے راہ روی اور جنسی بھوک کی بڑی خوبصورت عکاسی کی ہ۔ ان کے رجحان میں بنیادی رجحان کے اعتبار سے مارکس اور فرائڈ کے نظریات کا عکس ملتا ہے۔ اگرچہ وہ ان سے براہ راست متاثر نہیں ہیں لیکن معاشرے میں موجود جنسی اور معاشی ناہمواریوں نے ان کے یہاں وہ نگاہ پیدا کی جو زندگی کے معاشی اور جنسی حوالوں سے پیدا ہونے والی ناانصافیوں اور مجبوریوں کا ادراک رکھتی ہے۔ ان کی نظر ہمیشہ ان دکھوں اور مسائل کی طرف جاتی ہے۔ جو جنسی اور معاشی پس منظر میں انسان کے دکھوں میں اضافہ کرتے ہیں۔

افسانہ "حسرت" میں بھی غلام حیدر باپ کی جائداد اوباش قسم کے یار دوستوں میں لٹا دیتا ہے۔ اس کی بیوی بھی ان کے ساتھ مخلص نہیں تھی وہ خاوند کی رقم سے بھائی کی مدد کرتی رہی اس کو سیٹھ بنا دیا۔ غلام حیدر

۱۔ "رنگ برنگے انڈے" معین الحق" "الریحان مجلہ" سائنس کالج' ۸۸۔۱۹۸۷ء کوئٹہ ص نمبر ۴۹"

کے سات بچے تھے ناہید سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ چھ بھائی تھے وہ بھی باپ کی طرح آوارہ اور بدمعاش تھے۔ اس کی بیوی بھی پیروں فقیروں کے مزار پر جاتی تھی آخر میں ان ہی کی ہو کر رہ گئی۔ ناہید ماں کی بدچلنی کی وجہ سے ایک پیر کے عصمت سوزی کی بنا پر جان دے دیتی ہے۔ اس کی لاش شمشیر سے نکلی ملتی ہے۔ اور اس کی کھلی آنکھیں ماں سے یہ شکایت کرتی ہیں۔

(۱) "ماں' مائیں تو بیٹیوں کی ناموس کی حفاظت کرتی ہیں۔ تم کیسی ماں ہو۔ کیسی بیوی ہو۔ کیسی عورت ہو۔ عارضی رنگ رلیوں میں راہ سے بھٹک گئیں۔"

اس افسانے میں معین الحق نے اعلیٰ کردار نگاری کرکے ماؤں کو سبق دیا ہے جو اپنی بدچلنی اور بے راہ روی کی وجہ سے اپنے فرائض بھی بھول جاتی ہیں۔ اس افسانے میں معاشرتی ناہمواریوں کا ذکر کیا گیا ہے جہاں مردوں کو عورتوں پر سبقت حاصل ہے۔ جنسی اعتبار سے عورتوں کے لئے ایسے قوانین رائج ہیں کہ عورت معمولی سی لغزش کی بنا پر اپنی قیمتی زندگی سے ہاتھ دھو لیتی ہے۔ جبکہ مرد کی بے راہ روی کو معاشرے میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہی وہ ناانصافیاں ہیں۔ جن کی نشاندہی معین الحق نے اپنے افسانوں میں کی ہے۔ اور معاشرے کی ان ناہمواریوں کا ذکر دوسرے افسانوں میں بھی کیا ہے جو انہوں نے مختلف رسائل افکار' بوتہ' دنیا ڈائجسٹ اور جنگ اخبار کوئٹہ میں لکھے ہیں۔ ان میں مداوا' چوکی' فنکارہ' دورخ' شاخ بریدہ' مفو معطل' الجھے دھاگے اہم ہیں۔

انہوں نے ایک افسانوی مضامین کا مزاحیہ مجموعہ "کھن" کے نام سے بھی لکھا ہے۔ جس میں انہوں نے اس بات کا خیال رکھا ہے۔ کہ موضوع' کردار اور واقعات عام فہم اور سادہ ہوں جسے ہر خاص و عام سمجھ سکے اور لطف اندوز ہو سکے۔ زبان بھی صاف اور لطیف استعمال کی ہے۔ جو پھکڑپن سے پاک ہے ویسے طنز و مزاح لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ کیونکہ مزاح کا بنیادی مقصد شگفتہ انداز میں زندگی کی تلخیوں کو بے نقاب کرنا ہے مزاح نگار ہنسی کے ساتھ ساتھ اپنے لطیف انداز میں قاری کو ایسی ضرب لگاتا ہے کہ وہ اپنی حالت درست کرنے کے لئے سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

معین الحق نے اپنے ان مضامین میں واقعات کے بیان میں معاشرے کی خامیوں اور ناہمواریوں کی طرف زیادہ توجہ مبذول رکھی ہے۔ ان کا مزاحیہ انداز اتنا لطیف ہے کہ قاری پڑھ کر محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر ان کے چھوٹے چھوٹے فقروں کے پیچھے معنویت پوشیدہ ہے۔ جس سے قاری لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ اپنے مضمون "بہترین خدمت کی بہترین مثال۔ ہسپتال" میں خاص مسئلہ مکان کا در پیش ہے۔ مسعود صاحب کا تبادلہ

۱۔ "حسرت" "تاریکیاں" معین الحق' ص ۴۷

بلوچستان میں ہو جاتا ہے۔ اور وہ مکان کی وجہ سے سخت پریشان ہیں معین الحق صاحب انہیں ہسپتال کے "نیو سپیشل وارڈ" میں رہنے کا مشورہ دیتے ہیں وہ اسے ایک سپیشلسٹ کے پاس لے گئے اور خود ساختہ بیماریوں کا ذکر کر کے ہسپتال داخل کروا دیا۔ دوسرے دن جب وہ مسعود صاحب کا حال پوچھنے ہسپتال جاتے ہیں۔ تو وہ بہت پریشان نظر آئے

(۱) "شام نرس نے ٹیکہ لگایا ہے سوئی شاید بہت موٹی تھی لگتا ہے ہڈی میں کھب گئی ہے" مسعود نے کہا۔

(۲) "تم بھی تو۔ بیل ہو سوئی موٹی نہ ہوتی تو کیا باریک ہوتی" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

جب اگلے روز دوپہر کو کھانا لے کر گئے تو وہ اپنے کمرے میں موجود نہیں تھے۔ ڈیوٹی روم سے نرس نے آکر بتایا۔

(۳) "آپ کے دوست کا آپریشن ہوا ہے رات سوتے میں بازو کی ہڈی کا فریکچر ہو گیا ہے ایکسرے لیا ہے۔ ہڈی ٹوٹی نہیں دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ سٹیل کے پن پاس ہوں گے ماہر ڈاکٹر آپریشن کر رہے ہیں۔"

معین الحق نے مضمون کے اس حصے میں کام کی بے راہ روی بددیانتی کا راز فاش کیا ہے۔ اور پھر اس خامی کی طرف ڈھکے چھپے انداز میں طنز کے تیر چلائے ہیں۔ لکھنے کا انداز نہایت شگفتہ اور مسحور کن ہے۔ اسی طرح دوسرے مضمون "کیا آپ اٹیکیوکل اور ماڈرن ہیں؟" میں تحریر کرتے ہیں۔

(۴) "اگر بوٹ پہنتے ہیں تو تسمے کھلے رکھیے۔ اس لئے نہیں کہ بوقت پٹائی بغل میں داب بھاگنے میں آسانی رہے۔ بلکہ ماڈرن بننے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ جرابیں کبھی نہ پہنیں بھلا غلاف چڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر پہنتی ہی ہیں تو پھر کبھی نہ اتارنے کے لئے نہیں۔ جب بدبو کے بھبکے اٹھیں یا پاؤں گلنے سڑنے لگیں۔ تب بھی سوچ لیں ضروری سمجھیں تو اتار دیں۔"

مضامین "کھمن" "نام کا مسئلہ" میں بھی ان کا یہی انداز ہے۔ "انٹرویو" میں بھی اسی بے باکی سے واقعات پیش کئے ہیں۔

مجموعی طور پر ان کے افسانے کامیاب افسانے ہیں۔ ان میں نہایت خوبی سے معاشرتی عکاسی کی گئی ہے۔

۱-۲-۳ بہترین خدمت کی بہترین مثال" "ہسپتال" "کھمن" "معین الحق" ص ۴۵-۴۶
۴- "کیا آپ اٹیکیوکل و ماڈرن ہیں" "کھمن" "معین الحق" ص ۱۲۴

ان کے مزاح میں توانا اور صحت مند رجحان ملتا ہے۔ جو صحت مند زندگی کا نمائندہ بن سکتا ہے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے افسانوں میں زندگی کی خوشی اور ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے معاشرے کی خامیوں اور ناہمواریوں کو اجاگر کرتے وقت ہمدردانہ انداز نظر کا اظہار کیا ہے۔ ان کا ذوق مزاح نہایت عمدہ اور بلند ہے طنز نگاری میں اوچھا اور سطحی پن نہیں ہے۔ بلکہ الناکی ہے۔ یہ انسانی اقدار کا بڑا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ ان میں آدمی کا احترام، صداقت اور ایثار موجود ہے۔ محبت اور زندگی کے دکھ سکھ کو سمجھنے کی صلاحیت ہے۔

جمیل زبیری

جمیل زبیری بھی بلوچستان کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے انہوں نے ناول بھی لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں افسانوں کا پہلا مجموعہ "زرد پتے" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جو بیانیہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ دوسرے افسانوں کا مجموعہ "لمحوں کی دہلیز" میں تین حصوں میں کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔ پہلے حصہ میں کہانیاں بلوچی پس منظر کے تحت لکھی ہیں۔ جس میں بلوچستان کا ماحول اور تہذیب کی عکاسی ملتی ہے۔ دوسرے حصے میں منافقت اور ظلم و ستم پر مشتمل کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔ اور تیسرے حصے میں عام روزمرہ سے متعلق کہانیاں تحریر کی گئی ہیں۔ جو عام روزمرہ زندگی میں اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن ان سب افسانوں میں بلوچستان کا ماحول، فضا اور تہذیب کی عکاسی ملتی ہے کیونکہ وہ بلوچستان میں رہے ہیں۔ اس لئے انہوں نے بلوچستان کے پس منظر میں افسانے تحریر کئے ہیں۔

"لمحوں کی دہلیز" میں "شادی کور کی ڈھلوان پر" اس افسانے میں جمیل زبیری نے بلوچی معاشرے کے رسم و رواج ان کی روایات ان کے موسم، جغرافیائی فضا اور ماحول کی بہت اچھی عکاسی کی ہے۔ بلوچوں کی غربت اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل بڑے فنکارانہ طور پر پیش کئے ہیں۔ جمیل زبیری کے سب افسانوں میں انہوں نے معاشرتی ناہمواریوں اور ان کے مسائل کے پس منظر میں انسانی زندگی کے دکھوں کا احساس دلایا ہے۔ افسانہ "شادی کور کی ڈھلوان پر" محمود ایک پہاڑی پر رہتا ہے۔ جہاں ضروریات زندگی اور دیگر مسائل ہر وقت جنم لیتے ہیں۔ اس کی بیوی بیمار ہے اس کے بچہ ہونے والا ہے وہ سخت تکلیف میں ہے اور یہاں کوئی ہسپتال نہیں ہے شہر آنے جانے کی سہولت بھی فراہم نہیں ہے اس میں خانہ بدوشوں کی زندگی کے شدائد بیان کئے ہیں ان کے مسائل اور موسم کے شدائد دکھائے ہیں۔ شادی کور (ندی) میں پانی زیادہ چڑھ جانے کی

رفعت زیبا نے ناول بھی لکھے ہیں۔ ان کے ناول ہوں یا افسانے ان کا موضوع عورت اور مرد کے باہمی رشتوں معاشرتی رابطوں اور رفاقتوں کی ناہمواری سے جنم لیتا ہے۔ ان کے یہاں مرد کی ہوس پرستی سے پیدا ہونے والے وہ مسائل زیادہ نمایاں ہیں۔ جن سے عورت کو گزرنا پڑتا ہے۔ عورت کے اندر نرمی حلاوت محبت کی تمنا کو مرد کی ہوسناکی کس طرح روندتی ہے کس طرح اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور کس طرح ٹھکرایا جاتا ہے۔ بحیثیت مجموعی ان کے تمام افسانے اور ناول کا موضوع اسی چکر کے گرد قائم ہے۔

آغا گل

بلوچستان کے اہم افسانہ نگاروں میں ایک نام آغا گل کا ہے جنہوں نے ۸۰۔۹۰ کی دہائی میں اچھے افسانے لکھے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "گورنچ" کے نام سے چھپ چکا ہے۔

سراب اسلم تحریر کرتے ہیں۔

(۱) "بڑا ادب کبھی خلا میں تخلیق نہیں ہوتا وہ ایک خاص دھرتی اور معاشرت کی کوکھ سے کونپل کی مانند پھوٹتا ہے تناور پودے میں تبدیل ہوتا ہے اور پھر اس کی شاخوں پر جو پھول کھلتے ہیں وہ بلا امتیاز مذہب و ملت علاقہ اور زبان سب انسانوں کی اپنی مہکار سے معطر کرتے ہیں۔"

آغا گل کے افسانوں کا مجموعہ "گورنچ" بہت ہی دلچسپ اور چونکا دینے والا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ افسانے دوسرے افسانہ نگاروں کے افسانوں کے مقابلہ میں انفرادیت کے حامل ہیں۔ اس مجموعے میں صرف بارہ افسانے ہیں۔ جس میں انہوں نے بلوچستان کے خاص ماحول کو اپنے افسانوں کا پس منظر بنایا ہے۔ ان کی زندگی کی چلتی پھرتی تصویریں پیش کی ہیں۔ اور ان کے سماجی مسائل کو بڑے فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی اظہار خیال کرتے ہیں۔

(۲) "ادب کی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ ادیب جس معاشرے میں پیدا ہوا ہو اس نے نہ صرف اس معاشرے کی ترجمانی اور عکاسی کی بلکہ اپنے احساسات اور خیالات و نظریات سے اس کو بدلا بھی۔ یہ عمل صدیوں سے جاری رہا آج بھی جاری ہے۔ اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ادیب کو اس بات کا احساس نہ ہو کہ اس کے ہاتھوں یہ کام انجام پا رہا ہے لیکن اس کی تخلیقات سے لطف اندوز ہونے والے یا استفادہ کرنے والے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں اور محسوس کر سکتے ہیں کہ اس کی

۱۔ آغا گل کے افسانوی مجموعہ "گورنچ" پر ایک نظر' سراب اسلم' سہ ماہی "قلم قبیلہ" بلوچستان کوئٹہ' جنوری تا جولائی ۱۹۹۶ء' ص ۳۲

۲۔ "ادب اور معاشرہ" ڈاکٹر عبادت بریلوی' لاہور' "قلم قبیلہ" (منتخب ادبی تحریروں کا مجموعہ)' اگست ۱۹۸۱ء' ص ۶۷-۶۸

ادبی تخلیقات معاشرے کے لئے یہ اہم کام کر رہی ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ادیب تک جو ادب کو صرف تفریح طبع اور لطف اندوز ہونے اور لذت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کی تخلیقات بھی کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی زاویے سے یہ کام انجام دیتی ہیں۔ ایسے ادیبوں کے خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اپنی ادبی تخلیقات سے معاشرے میں اہم کارنامے انجام دیئے ہیں۔"

آغا گل کے افسانوں کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں ایک داستان گو کا انداز ملتا ہے واقعات تسلسل کے ساتھ چھوٹے چھوٹے فقروں کی شکل میں ایک لڑی میں خوبصورتی سے پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور یہ واقعات (دلچسپی کے ساتھ کسی منظر کی طرح آنکھوں کے سامنے سے گزرتے جاتے ہیں اور قاری پورا افسانہ ایک ہی نشست میں انہماک کے ساتھ ختم کر لیتا ہے۔ افسانہ "زن نبل" کا آغاز وہ اس طرح کرتے ہیں۔

(۱) "ان دنوں شہر بہت خاموش اور دن بہت طویل ہوا کرتے تھے فضا میں اتنا شور اتنا ہنگامہ نہیں تھا اور نہ زندگی اتنی ارزاں اور غیر محفوظ ہوا کرتی تھی۔ ان ڈور (Indoor) تفریح کا سامان نہیں تھا۔ لوگوں کے پاس نہ تو ریکارڈ پلیئر ہوا کرتے تھے اور نہ ہی ٹیپ ریکارڈ یہ سب کچھ حقوق یافتہ طبقے تک محدود تھا۔ بعض لوگوں کے پاس بڑے بڑے بے ہنگم ریڈیو ہوا کرتے تھے جنہیں وہ کشیدہ کاری والے غلافوں میں سجا کر رکھتے' مگر ان پر بھی دن بھر پروپیگنڈہ ہوتا یا پھر قوالیاں نشر ہوتیں۔ ان قوالیوں کا سننا خاصے دل گردے کا کام تھا۔ مگر بعض لوگ انہیں ضرور سنتے' خصوصاً جمعہ کے روز کیوں کہ مشہور تھا کہ قوالیاں سننے سے بہت ثواب ملتا ہے۔"

آغا گل نے اپنے مشاہدے' مطالعے کی وسعت کی وجہ سے افسانے میں ایک دلچسپ بیانیہ حسن پیدا کر دیا ہے۔ آغا گل کے افسانوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ انہوں نے افسانوں میں طنزیہ انداز بیان سے معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کی طرف نشاندہی کی ہے تاکہ قاری افسانہ پڑھتے وقت تلخیوں کی کڑواہٹ محسوس نہ کرے بلکہ افسانہ زیادہ دلچسپ ہو جائے آغا گل کا یہ افسانہ "پہر" یعنی ایسا کاکا جس کی برست نوکیں ہوں افسانے کا یہ حصہ دیکھئے۔

۱۔ "زن نبل" "گورنچ" آغا گل ۱۹۹۲ء ص نمبر ۱۔

(۱) "یقینی طور پر پیر کا وہی مفہوم ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔ یہ ساری دنیا ایک جلتا ہوا صحرا ہے جہاں مرنا بہت آسان ہے اور جینا سخت مشکل زندگی کے صحرا میں تین قسم کے کانٹے پائے جاتے ہیں۔ بادشاہ۔ جنرل اور پروہت۔ انسانیت ان تین کانٹوں نے تار تار کر رکھی ہے۔ ڈھائی ہزار سالہ تاریخ پڑھ کر دیکھ لو زندگی کے دشت و صحرا میں جو چیز کانٹوں سے الجھی تار تار ہو گئی برسوں پھڑپھڑائی ریشہ ریشہ بکھر گئی اس کی پہچان ختم ہو گئی۔ اس کا وجود مٹ گیا۔"

اس افسانے میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ افسانہ نگار افسانہ لکھتے وقت طنزیہ، مزاحیہ المیہ یا طربیہ انداز بھی اختیار کرے انداز بیان اتنا دلکش ہو کہ افسانہ پڑھنے میں ہر صورت دلچسپ رہے۔ اگر افسانہ دلچسپ نہیں ہو گا تو وہ افسانہ بھی نہیں ہو گا۔ افسانے کا دلچسپ ہونا بنیادی شرط ہے۔

آغا گل کے افسانوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں مقامی زبان استعمال ہوئی ہے۔ شروع میں پڑھتے وقت یہ الفاظ اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن افسانہ پڑھنے کے بعد یہ غیرمانوس الفاظ اپنی زبان کا لفظ محسوس ہونے لگتے ہیں۔ اس کی مثالیں ہمیں ان کے افسانے پیر کورہ گئی میں ملتی ہیں۔

آغا گل کے افسانوں کے موضوعات کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا یہ موضوعات دوسرے افسانہ نگاروں سے مختلف ہیں ہر افسانے کا رنگ جدا ہے ان کے افسانے رومان کے علاوہ سماجی حقیقت پسندی کے بھی حامل ہیں، ان کا پہلا افسانہ زرن مخیل ایک اچھا افسانہ ہے۔

ارتھر ڈویژنل آفس میں کلرک تھا۔ وہ بہت زیادہ مفلس و غریب ہونے کے باوجود چشتی کے خلاف دس ہزار روپے کے عوض بیان دینے سے انکار کر دیتا ہے۔

(۲) "رقم تو یقیناً میرے لئے بہت زیادہ ہے جوان بیٹی کی ذمہ داری بھی ہے۔ مقروض بھی ہوں مگر اپنے دوست کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ غربت میرے لئے نئی چیز نہیں مجھے تو وراثت میں ملی ہے۔"

اسی طرح آغا گل کا ایک اور افسانہ بابری مسجد بھی ایک کامیاب اور خوبصورت افسانہ ہے اس میں بابر مسلمان ہے اور شیل ایک ہندو لڑکی ہے دونوں بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے کھیلتے محبت کی زنجیروں میں جکڑ جاتے ہیں لیکن دونوں والدین کے عقائد مختلف ہونے کی وجہ سے ان کی شادی ناممکن تھی۔

۱۔ "پیر" "گھوررج" آغا گل، ص نمبر ۱۰۲۔
۲۔ "زرن مخیل" "گھوررج" ص نمبر ۸۔

بابر کی دونوں ٹانگیں فوجی مشق کے دوران ایک مشین گن کی زد میں آجانے کی وجہ سے زخمی ہو گئی تھیں اسے ہسپتال داخل کر دیا گیا۔ اس کا کزن ہیرگ جو جائداد کی وجہ سے اس کا دشمن تھا موقع پاکر اس پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ اور یہ مشہور کر دیا کہ اس پر ہندوؤں نے حملہ کیا ہے۔ بابر ہسپتال میں زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا شیل اسے وہیل چیئر پر لے مندر چلی جاتی ہے وہاں وہ یہ اعلان کر دیتی ہے کہ اسے ہندوؤں نے نہیں بلکہ اس کے کزن ہیرگ نے دولت کی خاطر اسے مارا ہے۔ اسی وقت لوگ ہیرگ پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ اور بابر چکرا کر سیڑھیوں سے گر کر خالق حقیقی سے جا ملتا ہے۔

آغا گل نے اس افسانہ میں ایک مذہبی تنازعے کو بڑی خوبصورتی سے حل کیا ہے۔ ان کا انداز بیان انتہائی دلچسپ ہے اسے پڑھ کر ان کی کاوش کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس میں رومان اور حسن و شباب کی حشر خیزیاں اور رعنائیاں پوری شدت کی ساتھ جلوہ گر ہیں۔ ان کا یہ افسانہ ایک کامیاب ترین افسانہ ہے۔

"کورہ گئی" اور "وادی قاف" بھی دلچسپ افسانے ہیں۔ "میلی" بھی ایک دلچسپ اور قابل توجہ افسانہ ہے۔ یہ افسانہ تاریخی ہے۔ اس میں انہوں نے بلوچستان کے جغرافیائی ماحول کی بہت خوبصورتی سے عکاسی کی ہے۔ افسانہ "روپے کا جن" بھی آغا گل کا ایک خوبصورت افسانہ ہے اس میں رومانوی رجحان زیادہ غالب ہے۔

(۱) "مجھے رہ رہ کر جن بابا کا خیال آتا۔ جو اسپتال کے سردخانے میں پڑا تھا دونیاں چونیاں لے کر کیسے خوشیاں بانٹا کرتا تھا۔ سبھی کی جھولی میں سکے ڈال دیا کرتا تھا۔ سرخ، نیلے، سنہری ا سنڈریلا محبت بھری مگر ویران نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی پھر وہ غیر محسوس طور پر مجھ پر جھکی اور سرگوشی کی: "کیا جلال خان واقعی مرگیا ہے" وہ مثبت جواب پاکر کہنے لگی۔ "ماں سے کہنا، میں تو اس کے ہی پاس جانے کے لئے دلہن کی طرح سجی ہوں"

اور پھر اس نے اپنے آپ کو ختم کرنے کے لئے پاؤں کے انگوٹھے سے گن کا ٹریگر دبا دیا۔

(۲) "میری مٹھی سے چاندی کا روپیہ چھوٹ کر گرا اور رول ہوتا ہجوم کے پیروں میں کہیں کھو گیا۔ آخر انہیں روپے کے جن نے ہرا ہی ڈالا۔ میں نے مایوسی سے سوچا اور اپنا روپیہ ڈھونڈنے لگا"

آغا گل کا یہ افسانہ اپنی تابناکی، اور حقیقت پسندانہ رومان پرستی کے ساتھ طنز و مزاح کا پہلو بھی لئے ہوئے ہے

۱۔ "روپے کا جن" "گھوررج" آغا گل، ۱۹۹۳، ص نمبر ۹۱، ۹۲۔

ان کے تحریر کے حسن اور تاثر نے قاری کے دل ودماغ پر بہت اچھا اثر چھوڑا ہے۔

آغاگل کے افسانوں کے مجموعے "گوریچ" گوریچ ٹھنڈی یخ بستہ ہوا کو کہتے ہیں قلات کے علاقے میں یہ گوریچ کوئٹہ میں قندھاری اور سندھ وپنجاب میں کوئٹے کی ہوا کہلاتی ہے۔ اس نام کی آغاگل کے افسانوں سے بڑی مماثلت ہے۔ اس مجموعے میں افسانہ "گوریچ" ایک بہت ہی مسحور کن افسانہ ہے۔ اس افسانے میں انہوں نے بلوچستان کی تہذیب وثقافت کی روح کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

(۱)"میرا بیٹا انسان دوست ہے' چاہتا ہے کہ ملک میں خوشحالی پھیل جائے' انصاف کا بول بالا ہو۔ سب کو اپنا حق ملے' کوئی بھوکا نہ سوئے کسی کا حق نہ چھینا جاسکے۔"

یہاں انہوں نے امن وصلح پسندی اور اونچ نیچ کی تفریق پر روشنی ڈالی ہے' اقتصادی ومعاشی زندگی کی ناہمواریوں کا ذکر کیا ہے۔

(۲)"شنک گھبرا کر اٹھ بیٹھا' اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ گوریچ تو پہلے محض کواڑ کھٹکھٹایا کرتی تھی۔ درودیوار پر دستک دے دے کر لوٹ جایا کرتی تھی۔ اپنی ان ہی وادیوں میں جہاں صبح وشام ملتے ہیں۔ مگر اب تو وہ دل ودماغ میں در آئی ہے۔ دماغ مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔ دل بے حس ہوگئے ہیں۔ جس باپ سے ملنے کے لئے پابرہنہ وہ سرد راتوں میں دروازے تک دوڑا چلا جاتا آج اسی باپ کو غریبوں کی بستی کی ایک کھولی میں چھوڑ آیا ہے۔ سارے انسانوں کو گوریچ نے (Cold Blooded Animal) بنادیا ہے۔ حالانکہ انسان گرم خون والی مخلوق میں شامل ہے محبت قربانی اور جذبات والا "گوریچ" شنک زندگی میں ایک بار پھر جذباتی ہو کر دیوانہ وار اٹھا "تم نے مفلوج و بے حس بنادیا تھا اور مجھے آج تک احساس نہ ہوسکا۔ میرے بچپن کی ساتھی مجھ سے دغا۔ اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔"

آغاگل کے اس افسانے میں تجربے' مشاہدے اور شعور کی پختگی کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ اس افسانے میں عوام کی بیداری اور سرمایہ پرستی کے خلاف احتجاج بھی ہے اور ایک مثبت وخوش وخرم زندگی گزارنے کا احساس ملتا ہے۔ ان کا یہ افسانہ فنی لحاظ سے ایک شاہکار افسانوں میں سے ہے۔

مجموعی طور پر آغاگل کے افسانوں میں تنوع' زندگی اور جدت پائی جاتی ہے۔ ان کے افسانے بنیادی

۱۔ "گوریچ" افسانوی مجموعہ "گوریچ"' آغاگل' ص ۱۱۴۔
۲۔ "گوریچ" افسانوی مجموعہ گوریچ' آغاگل' ص ۱۲۳

طور پر عشقیہ مزاج اور رجحان کے حامل ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ان کے افسانوں میں معاشی' معاشرتی اور جنسی زندگی کی ٹھوس حقیقتیں بھی ملتی ہیں۔ امید ہے آغاگل اسی توانائی کے ساتھ افسانے لکھتے رہیں گے۔ موجودہ افسانوں کی تازگی' گہرا مطالعہ اور مشاہدہ آغاگل کے اندر مستقبل کے ایک بڑے افسانہ نگار کا پتہ دیتا ہے۔

شاہین روحی بخاری

بلوچستان میں شاہین روحی بخاری نے بھی کچھ افسانے لکھے ہیں۔ مرد کی محکومی اور عورت کی مظلومی ایک حقیقت ہونے کے باوجود افسانہ نگاری کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ اپنے افسانوں کے بارے میں وہ لکھتی ہیں۔

(۱)"میں نے جب افسانہ نگاری پر توجہ دی تو میں سمجھتی تھی کہ میرے پاس ذاتی مشاہدہ ہے۔ لیکن تجربات کے عمل سے میں یکسر کوری رہی تجربات انسان کو زندگی میں حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن میرے لئے یہ تجربات خاندانی رنجش مشترکہ فیملی نظام محبت اور نفرتوں سے حاصل کئے۔"

شاہین بخاری کے افسانوں کا مجموعہ "کاغذ کا بدن" ۱۷ مختصر افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان افسانوں میں بلوچستان کی سرزمین اس کی تہذیب وماحول کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کا پہلا افسانہ "خدا کی آنکھیں" بڑی حد تک اہم افسانہ ہے جس پر آشوب اور عدم تحفظ کے دور سے ہم گزر رہے ہیں اس کی عکاسی انہوں نے بہت خوبی سے کی ہے ان کا یہ افسانہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے موضوع کی مناسبت سے ان کا جذباتی رد عمل دنیا میں عدم تحفظ کی نشاندہی کررہا ہے۔ ان کا انداز تحریر اس افسانے میں خاصہ اثر انگیز ہے اس میں انہوں نے مثبت اقدار کو ابھارنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس میں جنگ سے نفرت اور بچوں کے تحفظ کا احساس سے جینا دشوار محسوس ہوتا ہے۔ گزرے ہوئے المناک واقعات کی عکاسی جذباتی شدت سے کی گئی ہے۔

"چمن پیر" افسانے میں درمیانے اوسط طبقے کی ثقافت کی نمائندگی کی گئی ہے۔ اس میں ایک بوڑھا آدمی جو اس افراتفری اور نفسانفسی کے دور میں زندگی گزار رہا ہے جہاں مفادات کے رشتوں کے سوا کوئی اخلاقی اقدار باقی نہیں ہیں۔ بیٹا بہو سب اپنی مرضی کی زندگی گزارتے ہیں۔ اس شخص کی کوئی عزت نہیں کرتا۔ وہ ایک قابل نفرت معاشرے میں زندگی بسر کررہا ہے۔

شاہین روحی بخاری نے کیونکہ خود بھی ایسے ہی ماحول اور فضا میں زندگی کے بسر کی ہے انہوں نے اپنے

"کچھ اپنے بارے میں" "کاغذ کا بدن" روحی بانو' ص ۱۶۔

مشاہدوں و تجربات کی عکاسی کی ہے۔ جس میں نفرت بھی ہے اور محبت بھی۔

افسانہ "سویٹ ہارٹ"۔ اس افسانے میں شاہین بخاری نے ایک ایسے اعلیٰ طبقے کی عکاسی کی ہے جو مشرقی
ہوئے بھی ماڈرن انداز اختیار کئے ہوئے ہے۔ شمو اسی ماحول میں پرورش پاتی ہے۔ لیکن وہ ایک سنجیدہ
شرمیلی سی لڑکی ہے ارسلان ایک شوخ و شریر لڑکا ہے۔ جو اس ماحول میں رہنے کے باوجود ماڈرن انداز
نہیں کرتا وہ شمو کو چاہتا ہے اور شمو بھی اسے بے حد پسند کرتی ہے۔ وہ سویڈن ٹریننگ کے لئے چلا جاتا ہے تو
ہے "سویٹ ہارٹ" کا مذاق کرتا ہے سویڈن کی ایک سنہری بالوں والی خوبصورت چوہیا کو "سویٹ ہارٹ"
کر سویڈن ایک ڈرامہ رچاتا ہے۔ یہ کھیل وہ پورے تین ماہ کھیلتا ہے۔ اور جب واپس چوہیا کو لے کر
پاکستان آتا ہے تو راز کھلتا ہے اس دوران شمو بہت پریشان و اداس رہتی ہے۔ افسانہ ڈرامائی انداز میں
لکھا گیا ہے۔ جس میں مشرقی اور جدید ماحول کا فرق ظاہر کیا گیا ہے۔ زبان صاف اور شائستہ استعمال کی ہے۔

رومانوی رجحان غالب ہے۔

اسی طرح دوسرے افسانے "ڈارلنگ" اور "کاغذ کا بدن" بھی اسی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ جس میں
رجحان رومانوی ہے۔ اکثر افسانوں میں یہی رجحان غالب ہے۔ قدیم اقدار سے پہلوتہی اختیار کی گئی ہے۔ ان
کے افسانوں میں شہری اور دیہاتی زندگی میں دیہاتی اور شہری زندگی دونوں کے رنگ ڈھنگ الگ الگ ہیں۔
دیہاتی زندگی میں پرانے رنگ ڈھنگ اور طور طریق ہیں۔ شہری زندگی میں نیا ڈھنگ ہے۔

لیکن دونوں میں عورت کی حیثیت ایک ہی طرح کی ہے۔ "بیری کے درخت" میں لجے کا باپ لجے کی ماں
کے ساتھ سخت برتاؤ کرتا ہے۔ اسے بہت کمتر اور جوتی کے برابر سمجھتا ہے جبکہ "ڈارلنگ" افسانے میں ...
اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ وہ نئی عورت بن کر شوہر کی ترقی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔
دراصل زبیر جس فرم میں کام کرتا ہے۔ وہاں کٹے ہوئے بالوں والی عورت کو پسند کیا جاتا ہے۔ جبکہ اس کی بیوی
کو ریشمی لمبے بال پسند ہیں۔ وہ کٹوانا نہیں چاہتی۔ لیکن وہ اپنے خاوند کے شوق و پسند کی وجہ سے بال کٹوائی
ہے۔

شاہین بخاری بنیادی طور پر ایک صحافی ہیں، ان کی نگاہ میں وہ گہرائی اور تخیلاتی فضا پیدا نہیں ہو سکی
ایک کامیاب افسانہ نگار کے لئے ضروری ہے۔ ان کی تحریر میں افسانوی حسن اور حقیقت کا وہ گہرا امتزاج
نہیں ہے جو افسانے کو افسانہ بناسکے۔ سطحی موضوعات اور سطحی رنگ روغن والی زندگی کو انہوں نے

افسانوں کا موضوع بنایا۔ لیکن تحریر میں وہ قوت کم ہی پیدا ہو سکی جو انہیں افسانہ نگاری کی حیثیت سے کوئی اہم
مقام دلا سکتی۔

مجموعی طور پر ہم نے اس باب میں بلوچستان کے اہم افسانہ نگاروں کا جائزہ لیا ہے۔ جس میں ڈاکٹر فردوس
انور قاضی، معین الحق اور آغا گل کے افسانوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان سب افسانہ نگاروں کے افسانوں میں
رومانوی رجحان غالب ہے۔ ڈاکٹر فردوس انور قاضی کے افسانوں میں بنیادی رجحان رومانوی صداقت اور حقائق
پر مبنی ہے۔ زیادہ تر افسانوں میں نچلے طبقہ کے مسائل جس میں جنسی معاشی معاشرتی مسائل کا عمیق جائزہ پیش
کیا ہے۔

معین الحق کے افسانوں میں حقیقت نگاری کا رجحان ہے انہوں نے معاشی ناہمواریوں سے پیدا ہونے والے
مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ مزاح نگاری کے صحت مندانہ رجحان کی مدد سے معاشرے کی خامیوں
اور ناہمواریوں کو اجاگر کرنے میں ہمدردانہ انداز نظر اختیار کیا ہے۔

آغا گل کے افسانوں میں بنیادی طور پر رومانوی مزاج اور رجحان حاوی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ انہوں نے
معاشی، معاشرتی اور زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کو بھی موضوع بنایا ہے ان کے افسانوں میں تجربے، مشاہدے
اور شعور کی بنا پر فکری زاویہ حاوی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

پروفیسر ڈاکٹر فردوس انور قاضی کا ناول "خوابوں کی بستی" شبل پبلیکیشنز نے ۱۹۹۰ء میں پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقع پر شائع کی۔ یہ ناول پاکستان کے تعلیمی اور سیاسی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔

"خالق کی مخلوق" بھی عشق و محبت پر مبنی افسانہ ہے۔ ایک مسلمان حاجی محمد بخش کے بیٹے احمد اور ہندو لال کے سیٹھ کرم داس کی بیٹی الپنا کا محبت کا قصہ ہے جو ہولی کے کھیل کے ساتھ محبت میں جکڑ جاتے ہیں۔ اور جو دو مذہبوں کی رکاوٹ پھلانگ کر سبی چھوڑ جاتے ہیں۔ اور شادی کرنے کے بعد عیسائیت قبول کر لیتے ہیں۔ انسانیت عالمی مذہب ہے۔

عارف ضیاء کے افسانے "خالق کی مخلوق" میں حب الوطنی کا احساس ابھرتا ہے۔ جو ہندو مسلم اتحاد کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ وہ وطن کی سرزمین سے بے پناہ پیار کرتے ہیں۔ ہندو مسلم، سکھ عیسائی، بلوچی سندھی اور پنجابی سب سے ان کو پیار ہے۔ اور یہ سب اس دھرتی کے مختلف روپ ہیں۔

ان کا یہ افسانہ انسان دوستی، امن و آشتی، محبت و اخوت کو مقصد بنا کر لکھا گیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کے یہاں اصلاحی اور رومانی رجحان پایا جاتا ہے۔ جس میں حقیقت کا ہلکا ہلکا پرتو معاشرتی اور سماجی حوالوں سے نظر آتا ہے۔

اس افسانے میں انہوں نے معاشرے کے دکھ درد، ان کی محبت، معاشی و معاشرتی الجھنیں اور مسائل بیان کئے ہیں۔

ان کا ایک اور افسانہ "منڈی" جو ان کے افسانوی مجموعے "سیپ کے اندر موتی" میں شامل ہے اور اخبار جنگ کوئٹہ کے ادبی صفحے پر ۲۴ فروری ۱۹۹۲ء میں چھپا ہے۔

اس افسانے میں ایک مہاجر لڑکی پلوشہ کی کہانی ہے۔ جو ایک افغانی لڑکے طور دل سے محبت کرتی تھی۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ مہاجر بن کر پاکستان آگئی تھی۔ یہاں وہ دس سال تک افغان خانہ جنگی کے ختم ہونے کے لئے دعائیں مانگتی رہی تاکہ واپس افغانستان جا کر اپنے محبوب سے مل سکے۔ لیکن اسے منڈی میں جانوروں کی طرح ایک دولت مند ادھیڑ عمر کے شخص عبدالعلی خان کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ اب وہ یہ دعائیں مانگتی ہے۔ افغانستان میں کبھی امن قائم نہ ہو تاکہ نہ تو مہاجرین افغانستان جائیں اور نہ ہی اس کا اپنے محبوب سے آمنا سامنا ہو سکے۔

اس افسانے میں عارف ضیاء نے غربت و افلاس اور ان سے پیدا ہونے والے معاشی و معاشرتی مسائل اور معاشرتی خامیوں کو بیان کیا ہے۔ اور بلوچستان کی غلط رسومات کی نشاندہی کی ہے۔ جو چند سکوں کے خاطر بھولی بھالی لڑکیوں کی زندگیاں تلخ کر دیتے ہیں۔ اس افسانے میں مرد کی عورت کے ساتھ اسی ناانصافیوں اور

زیادتیوں کا اظہار کیا گیا ہے۔

فاروق سرور

فاروق سرور کا تعلق بلوچستان کے شہر کوئٹہ سے ہے۔ فاروق سرور کے افسانے معاشرتی سطح پر ہونے والی کیفیتوں اور حقائق کی ترجمانی کرتے ہیں۔ فاروق سرور کے پشتو کے تین افسانوی مجموعے "دریہ" "تندہ" اور "لیوہ" شائع ہوئے ہیں۔ اور انکے افسانے زیادہ تر علامتی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ ان کا پیشہ وکالت ہے۔ اپنے پیشے کی مصروفیات کے باوجود وہ افسانہ نگاری سے بھی نہایت عمدگی سے رابطہ رکھے ہوئے ہیں۔

فاروق سرور کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ اردو میں ان کے پشتو افسانوں کے تراجم پر مشتمل "ندی کی پیاس" کے نام سے مارچ ۱۹۹۶ء میں چھپ چکا ہے۔ اس میں کل ۱۰ افسانے ہیں۔ جو زیادہ تر علامتی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ اور وہ کسی خاص مقصد اور پیغام کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا آغاز اس قدر دلچسپ ہے۔ کہ قاری پورا افسانہ ایک نشست میں پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مثلاً ان کا افسانہ "فاختائیں" کا آغاز وہ یوں کرتے ہیں۔

(۱) "میں مر چکا ہوں، میرا جسم ٹھنڈا ہے اور میرا چہرہ زرد میرا خیال ہے رات کو سوتے میں میری موت واقع ہوئی ہے۔ میں تو ٹھیک ٹھاک تھا۔ بیمار بھی نہیں تھا۔ پھر کیسے مر گیا میں سوچنے لگتا ہوں۔ ہو سکتا ہے۔ مجھ پر دل کا دورہ پڑا ہو جو جان لیوا ثابت ہوا ہو"۔

(۲) "وہ بہت دیر سے بس سٹاپ پر کھڑا بس کا انتظار کر رہا ہے۔ لیکن بس ہے کہ آنے کا نام نہیں لے رہی بس سٹاپ ایک لمبی سی چکیلی سڑک پر واقع ہے جس کے دونوں طرف دور دور تک سایہ دار گھنے درخت کھڑے ہیں۔ اچانک اسے ایک عجیب سی آواز سنائی دیتی ہے اس کی نظریں فوراً سامنے درخت کی طرف اٹھتی ہیں۔ جہاں ایک پرندے نے اپنے پروں پر لکڑی پر سجائے ہیں۔ اور وہ ان سے اڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن بار بار ایسا کرنے کے باوجود وہ اڑنے میں کامیاب نہیں ہو رہا۔ وہ حیران ہو جاتا ہے۔ اور یہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ کہ پرندہ ایسا کیوں کر رہا ہے"۔

فاروق سرور اپنے افسانوں میں جو کچھ لکھتے ہیں سچائی اور بے باکی کے ساتھ اسی ماحول اور فضا میں ڈوب کر لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر فاروق احمد ان کے افسانوی مجموعے "ندی کی پیاس" کے دیباچے میں تحریر کرتے ہیں۔

"فاختائیں" "ندی کی پیاس" فاروق سرور ص نمبر ۸۵ مارچ ۱۹۹۶ء

"از آن" "ندی کی پیاس" فاروق سرور ص نمبر ۱ مارچ ۱۹۹۶ء

(۱) "اچھے افسانے کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ اپنے آپ کو خود پڑھوا لیتا ہے۔ فاروق سرور کے تمام افسانے اس خوبی کے حامل ہیں۔ وہ علامتی رنگ میں گفتگو کریں یا براہ راست مخاطب ہوں ان کا افسانہ پڑھنے والے کو پوری طرح متوجہ رکھتا ہے۔ ان کا منظر نامہ ان کے مشاہدے سے ہی اخذ کیا گیا ہے۔ وہ جس فضا اور ماحول سے تعلق رکھتے ہیں وہی سب کچھ پیش کر دیتے ہیں۔ ان دیکھی دنیا کا سفر فاروق سرور کے یہاں بہت کم ملے گا۔ انہوں نے اپنے افسانوں کی فضا بلوچستان کے منظر نامے سے ہی اخذ کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں بڑی جاذبیت اور دلکشی ہے۔"

فاروق سرور نے افسانہ "بھیڑیا" میں آج کل کے ڈرے اور سہمے ہوئے انسانوں کی ترجمانی کی ہے۔ انہوں نے اس افسانے میں آدمی کے اندر کے خوف اور ڈر کو پیش کیا ہے۔ جب ڈر اور خوف آدمی کے لاشعور میں بیٹھ جاتا ہے۔ تو پھر ہر چھوٹی سی چیز سے وہ خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ دراصل فاروق سرور ہمیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر ہم ہمت، حوصلہ اور بہادری سے کام لیں تو ہم معاشرہ کو ترقی دے سکتے ہیں۔ اس کی حالت بدل سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم خوف وڈر اور بزدلی سے کام لیں گے۔ تو معاشرہ بجائے ترقی کرنے کے تنزل کی طرف مائل ہو گا۔ فاروق سرور بزدلی اور خوف وڈر دکھا کر ان میں ہمت و حوصلہ اور ولولہ پیدا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ فاروق سرور کی یہی سوچ "بھیڑیا" کے آخری سطور میں ملاحظہ کیجئے۔

(۲) "میں جب ارد گرد دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں میرے چاروں طرف بے شمار درخت ہیں۔ ہر درخت میں کسی نہ کسی شخص نے پناہ لے رکھی ہے۔ اور نیچے اس کا بھیڑیا کھڑا غرا رہا ہے۔ اب میں زور زور سے ہنستا ہوں قہقہے لگاتا ہوں اور ان سادہ اور معصوم لوگوں کی طرف بڑھتا ہوں جو ناحق اپنے بھیڑیوں سے خوفزدہ ہیں"۔

اسی طرح "اژان" بھی ان کا ایک کامیاب علامتی افسانہ ہے جس میں انہوں نے موجودہ حالات کی بے سمتی، تیز رفتاری کو بہت خوبصورتی اور سلیقے سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے۔ اس میں انہوں نے ہماری موجودہ صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہماری موجودہ نسل ظاہری چمک دمک اور دوڑ میں آگے نکلنے کے شوق میں اپنے اخلاق اور تہذیب کو فراموش کر کے زندگی کی بے سمتی و بے رنگی کا شکار ہو کر رفتہ رفتہ تباہی و بربادی کی طرف جا رہی ہے۔

۱۔ "سہمے ہوئے آدمی کا کرب اور فاروق سرور" دیباچہ ڈاکٹر فاروق احمد "ندی کی پیاس" "فاروق سرور" ص ۱۳، ۱۴، مارچ ۱۹۹۶ء

۲۔ "بھیڑیا" "ندی کی پیاس" "فاروق سرور" ص نمبر ۲۲، مارچ ۱۹۹۶ء

فاروق سرور نے یہ افسانہ آج کے معاشرے کی بدلتی ہوئی زندگی کے حوالے سے لکھا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بے اعتدالیاں جس طرح ہماری زندگی کی سوچ، افکار و خیالات کو متاثر کر رہی ہیں۔ فاروق سرور نے اپنے افسانوں میں اس کی ترجمانی کی ہے۔

بقول ڈاکٹر فاروق۔

(۱) "یہ افسانے ہمارے کرب کی ایسی تصویریں ہیں جنہیں ہم شاید دیکھنا پسند نہیں کرتے کیونکہ یہ ہمارے اندر کی غلاظتوں کو نمایاں کرتے ہیں۔ فاروق سرور کے افسانے ایسے باشعور، تعلیم یافتہ اور سوچتے ہوئے ذہن کی آواز ہیں جو ماضی کی فرسودہ روایات سے بھی ملول ہے اور مستقبل کے تھکا دینے والی بے مقصد اور بے چہرہ تیز رفتاری سے بھی نالاں ہے۔ یہ افسانے زندگی کی توقیر جانتے ہیں۔ اور ہم سے بھی یہ توقع رکھتے ہیں۔ کہ زندگی کو کیسے اور کیونکر برتا جانا چاہئے۔ آج کی افسانہ نگاری میں فاروق سرور کے افسانے اپنے دلکش اسلوب خوبصورت علامتی انداز اور نکھری ہوئی فکر کے باعث پڑھنے والے پر یقیناً اثر انداز ہوں گے"۔

فاروق سرور نے ایک اردو افسانہ "پرندہ" کے نام سے لکھا ہے جو عنقریب سہ ماہی رسالے قلم قبیلہ کوئٹہ میں چھپنے والا ہے۔ یہ ایک علامتی افسانہ ہے اس افسانے میں پرندہ محبت کا استعارہ ہے اس میں بنیادی بات ہتھیاروں سے نفرت ہے۔ اگر جنگی ہتھیار پھینک دیے جائیں تو زندگی امن و سکون کے ساتھ گزر سکتی ہے۔ ان ہتھیاروں کی وجہ سے نفرت اور قتل و غارت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مجموعی طور پر فاروق سرور کے افسانوں میں بیان کی جدت اور ندرت ہے۔ وہ ایک ذہین افسانہ نگار ہیں۔ ان کے قلم میں شاعرانہ حسن ہے۔ ان کا مشاہدہ اور زندگی کا گہرا مطالعہ ان کے افسانوں میں وہ گہرائی پیدا کر دیتا ہے جو فن افسانہ نگاری میں ان کے نام کو شہرت عام اور بقائے دوام بخشنے پر قادر ہے۔

ظفر معراج

بلوچستان کے نئے افسانہ نگاروں میں ایک نام ظفر معراج کا بھی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں بلوچستان کی تہذیب اور ان کے غلط و فرسودہ رسم و رواج خواتین کے مسائل ان کے دکھ محرومیاں، جہالت و افلاس اور جنسی ہوس پرستی کے موضوعات پر افسانے لکھے ہیں۔ اور ان افسانوں میں ان مسائل کو محسوس

"سہمے ہوئے آدمی کا کرب اور فاروق سرور" دیباچہ ڈاکٹر فاروق احمد "ندی کی پیاس" "فاروق سرور" ص نمبر ۱۵، ۱۶، مارچ ۱۹۹۶ء